فکر و نشاط

جوش (ملیح آبادی)

ناشر

کتب خانہ رشیدیہ دھلی

سنہ ۱۹۳۹ء

بار دوم

مجلد عہ/

فہرستِ مضامین

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاکست

(اقبالؔ)

فکر و نشاط

جوشؔ ملیح آبادی

ناشر

کتب خانہ رشیدیہ دہلی

طبع دوئم — قیمت مجلد عہ — دو ہزار

بزیرِ ہر بُنِ مو چشمِ روشنیست مرا
بروشنائیٔ ہر ذرّہ روزنیست مرا

(نظیری)

شمعِ فروزاں

میں اے جوشؔ! اس دور میں ہوں وہ شاعر
اندھیرے میں جس طرح شمعِ فروزاں

حریفوں کے آگے مری شاعری ہے
کہ ہے پیشِ تورات و انجیل، قرآں

مرا دل، وہ فیاض خرمن ہے، جس سے
چمن ریز ہے دامنِ خوشہ چیناں

دمِ فکر دل میں مچاتی ہے دھومیں
تمنّائے بیداریِ نوعِ انساں

مرا شعر اس عصرِ بے رنگ و بُو میں
پسِ تیرگی جلوۂ آبِ حیواں

مرا دل دھڑکتا ہے یوں زیر و بم سے
جھپکتی ہے جس طرح مژگانِ دوراں

مری طبع ہے، تازہ اندیشیوں سے
شگفتہ تر از خندۂ نازنیناں

مری سادگی میں بھی وہ دلکشی ہے
شبِ ماہ میں جس طرح خوابِ طفلاں

شبِ تار میں میری آشفتہ حالی
دمِ صبح گویا خمِ زلفِ جاناں

مرے ذہن پر رشحۂ ابرِ معنی
جوانی کے ماتھے پہ جس طرح افشاں

مری بارشِ فکرِ رنگیں کی رَو میں — مُنقّش مُتنک رنگیٔ ہم نشیناں

بساطِ ادب پر مری طبعِ رنگیں — سرِ شاخ جس طرح مرغِ خوش الحاں

مری چشمِ تر میں تمنّا کی ہل چل — سرِ آب جس طرح موجِ چراغاں

خراماں ہے دل میں مرے رُوحِ وحشت — بہ اندازِ دوشیزگانِ بیاباں

مری رُوح پر عکسِ تخئیلِ رنگیں — جبیں پر ہو جس طرح زلفِ پریشاں

مرے دل میں عہدِ تمنّا کی راتیں — گھنے باغ میں جس طرح برقِ باراں

مرا دل ہے اے جوشؔ داغوں کی ضو سے

"برشتہ تر از حسنِ صحرانشیناں"

سعیِ لا حاصل

اے جوشؔ تنگیوں میں پُر افشاں ہوئے تو کیا
بہروں کی انجمن میں غزل خواں ہوئے تو کیا

ہندوستاں غلام ہے، گونگا ہے، سرد ہے
ہندوستاں میں آپ سخنداں ہوئے تو کیا

اک وسوسہ جو قوم ہو خودی صدورِ ناس
اس وسوسے میں جذبۂ ایماں ہوئے تو کیا

جس چرخِ تیرہ پر ہو سیہ ابر کا ہجوم
اس چرخِ تیرہ پر مہِ تاباں ہوئے تو کیا

جو سرزمینِ شور ہو محرومِ رنگ و بُو
اُس سرزمیں پہ ابرِ خراماں ہوئے تو کیا

موجوں نے جس کی توڑ دیا ہو صدف کا دل
اُس جوئے غم میں قطرۂ نیساں ہوئے تو کیا

جس گلستاں میں ایک ہے، کانٹا ہو یا گلاب
اُس گلستاں میں سُنبل و ریحاں ہوئے تو کیا

ہم وزن و ہم گہر ہوں جہاں زاغ و عندلیب
اُس گلستاں میں مرغِ خوش الحاں ہوئے تو کیا

جس تیرگی میں ہو نہ سکندر نہ روحِ خضر
اس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا

نکلے نہ صحنِ خانہ سے باہر جہاں نظر
واں آپ کائنات بہ داماں ہوئے تو کیا

اندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں سابقہ
اے جوشؔ آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

موسیقی کا جزیرہ

کانپتی ہیں اُنگلیاں مُطرب کی جب مستانہ وار
راگنی کی آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار

عِشق کا جب نبضِ آہن میں مچلتا ہی لہو
لحن کے سانچے میں جب ڈھلتی ہی دل کی آرزو

نغمۂ شیریں کا جب گرتا ہے رنگیں آبشار
دل کو چھو لیتی ہی اک موہوم سی باریک دھار

درد سے کھاتی ہیں جب موجیں ہوا کی پیچ و تاب
خود سے اُٹھ جاتی ہی جب سلمائے ماضی کی نقاب

دن ہی رہتا ہی نظر کے سامنے باقی نہ رات
ساز کے پردوں میں چھپ جاتی ہی ساری کائنات

نے میں لفظوں کی طرح جس وقت لہراتا ہی دل
اک جنوں پرور جزیرہ میں پہنچ جاتا ہی دل

رُوح ہوتی ہی جہاں اس گمشدہ شے سے دوچار
جس کے کھو جانے سے میری زندگی تھی سوگوار

پھر بھی پانے کی طرح اس چیز کو پاتا نہیں
شکل سے پہچانتا ہوں، نام یاد آتا نہیں

۷

نقّاد

رحم اے نقّادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

شاعری اور منطقی بحثیں، یہ کیسا قتلِ عام
پرسشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام!

کیوں اُٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کیلئے؟
کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لئے؟

اے ادب نا آشنا! یہ بھی نہیں تجھکو خیال
تنگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال

منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دلپذیر
کاش اس نکتہ کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر

یعنی اک لَے سے لبِ ناقد کو کُھلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیے

شعر فہمی کیلئے ہیں جو شرائط بے خبر
سوچ، تُو پورا اترتا بھی ہے اس معیار پر؟

جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کو دل کا تو نے داغ؟
آنچ سے جس کی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ؟

دل سے اپنے پوچھ او زندانیٔ علمِ کتاب!
حُسنِ قدرت کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب؟

تو پتا اسرارِ ہستی کا لگاتا ہے کبھی؟
عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی؟

کیا وہاں بھی اُڑ کے پہنچا ہے کبھی اے نکتہ چیں؟ — کانپتا ہے جس فضا میں شہپرِ رُوح الامین!

خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دُھنتا ہے تو؟ — قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو؟

اُن بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب؟ — خاک کو پرچھائیاں جن کی بناتی ہیں گلاب

جو تبسم چھین لیتے ہیں شبِ مہتاب سے — جن کی برنائی جگاتی ہے دلوں کو خواب سے

سچ بتا تو بھی ہے کیا اے کشتۂ صد حرص و آز — رازدانِ کاکلِ شبرنگ و چشمِ نیم باز!

تیری نبضوں میں بھی مچلی ہے کبھی بجلی کی رَو؟ — سوزِ غم سے تیرا دل بھی کیا کبھی دیتا ہے لَو؟

سچ بتا، اے عاشقِ دیرینۂ فکرِ معاش! — زہر میں تریاق کے عنصر کی بھی کی ہے تلاش؟

مجھ سے آنکھیں تو ملا اے دشمنِ سوز و گداز! — تجھ پہ کیا اضداد کی توحید کا افشا ہے راز؟

تیری راتوں کی سیاہی میں بھی اے ظلمت مآب — کیا کبھی طالع ہوا ہے مسکرا کر آفتاب؟

تو گیا بھی ہے نگارِ غم کی محمل کے قریب؟ — آنچ سی محسوس ہوتی ہے کبھی دل کے قریب؟

طورِ معنی پر بھی اے نافہم چڑھ سکتا ہے تو؟ — کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو؟

یہ نہیں تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوہ اور ہے
تیری دُنیا اور ہے، شاعر کی دُنیا اور ہے

شعر کی تحلیل سے پہلے مری تقریر سن — خود زبانِ شعر سے آ شعر کی تفسیر سن

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار — نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار

ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیبِ ادب — ڈھل کے گو وہ "گوہرِ غلطاں" کا پاتی ہیں لقب

اور ہوتی ہیں تجلی بخشِ تاجِ زرفشاں — پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں

جن کے اسرارِ درخشاں روح کی محفل میں ہیں

سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں

شاعری کا خانماں ہے نطق کا ٹوٹا ہوا — اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا

چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر — ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر

جاگتے رہتے ہیں دل کی محفلِ خاموش میں — بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کی آغوش میں

لوگ جن کی جانگدازی سے ہیں دل پکڑے ہوئے — کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے

شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال — سانس کی گرمی سے پڑ جاتا ہے اس شیشے میں بال

جام میں آتے ہی اڑ جاتی ہے شاعر کی شراب — ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب

اس سے بڑھکر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات

"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

"شعر" کیا جذبوں کا ایک نقشِ ناتمام — "مشتبہ سا اک اشارہ" ایک مبہم سا کلام

کیف میں اک لغزشِ پا "کلکِ گوہربار کی — "اضطراری ایک جنبش سی" لبِ گفتار کی

"ایک صوتِ خستہ و موہوم سازِ ذوق کی " — "مرتعش سی ایک آواز" انتہائے شوق کی

"بے حقیقت نے" کے اندر "زمزمۂ داؤد" کا
"عارضِ محدود" پر اک "عکسِ لامحدود" کا

"شعر" کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال"
"شعر کیا ہے؟ عشق و حکمت کا مقامِ اتصال"

"ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی"
"پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرّات کی"

"جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں"
"ٹوٹنا رنگیں ستارہ کا اندھیری رات میں"

"شعر" کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحنِ دلنشیں
"شعر کیا؟ ہر چیز کہکر، کچھ نہ کہنے کا یقیں

"شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا"
"برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا"

"تر زبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو"
"لفظ و معنی میں توازن کی نہفتہ آرزو"

بادلوں سے ماہِ نو کی اک اچٹتی سی ضیا"
"جھانکنا قطرہ کے روزن سے عروسِ سحر کا"

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں، یہ مسئلہ نازک ہے، آسکتا نہیں

تو سمجھتا تھا، جو کہنا چاہیے تھا، کہہ گیا
پوچھ شاعر سے، کہ وہ کیا کہہ سکا، کیا رہ گیا

کون سمجھے "شعر" یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

پیش کش

اے صبح! اے عروسِ دلآویزِ عشوہ کام — رنگیں مزاج و زہرہ جبین و فلک مقام
شیریں لب و شگفتہ و گلرنگ و لالہ فام — لے اپنے کمترین پرستار کا سلام

قربان تیرے خندۂ گوہر سرشت کے
دل میں کھلے ہوئے ہیں دریچے بہشت کے

تو نے ہرِ خیال کو زانو عطا کیا — دھوئے جو دل سے غم کو وہ آنسو عطا کیا
دی فکر اور فکر پہ قابو عطا کیا — پہلو کو دل زبان کو جادو عطا کیا

تو نے خموشیوں کو ترانہ بنا دیا
ہر جنبشِ نظر کو فسانہ بنا دیا

سینے میں ولولوں کا تلاطم تجھی سے ہے — خاموشیوں میں شانِ تکلم تجھی سے ہے
موجِ نفس میں سوزِ ترنم تجھی سے ہے — تخیل کے لبوں پہ تبسم تجھی سے ہے

کیا بات تیرے زمزمۂ بے عدیل کی
کانوں میں آ رہی ہے صدا جبرئیل کی

ہر چند دل شکن ہے زمانہ کی دار و گیر
پھر بھی بحکمِ ذوق و بہ اندیشۂ ضمیر

شاعر تری جناب میں اے حسنِ بے نظیر!
حاضر ہوا ہے لے کے پھر اک تحفۂ حقیر

فیضِ نگاہِ ناز سے کانٹے کو پھول کر
اے تاجدارِ حسن! اسے بھی قبول کر

رقص

ہاں اٹھا لے روحِ موسیقی ربابِ زر فشاں
رقص کی تشریح پر مائل ہے شاعر کی زباں

رقص کیا ہے؟ خاک کے دل میں خروشِ کائنات
پیکرِ فانی میں گرمِ ناز، لافانی حیات

جلوۂ محدود کے دل میں بہ ایمائے شباب
حسنِ لامحدود بن جانے کا شیریں پیچ و تاب

چاندنی میں جوئے شیریں جیسے تھم تھم کر بہے
اَپسراؤں کی شعر گوئی، ساعدوں کے زمزمے

محفلِ صورت میں لیلائے معانی کا بناؤ
چشمکِ بیباک میں سیّال نغموں کا بہاؤ

خون میں لہروں پہ لہریں لحنِ بے آواز کی
لغزشوں پر لغزشیں مشقِ خرامِ ناز کی

خیر سمجھا دوں، ذرا لانا تو مینائے شراب
رقص اس موقع پہ چہرہ سے اُلٹتا ہے نقاب
جب صبا کی سنسناہٹ اور ساغر کی کھنک
قامتِ موزوں میں بن جاتی ہے ہلکی سی لچک

رقص ہے دراصل برنائی کا لحنِ بے خروش
قلبِ نازک میں تمنّائے ہم آغوشی کا جوش

جنبشِ مژگاں کی رنگیں، مست، شیریں داستاں
عشوۂ ترکانہ کی سحر آفریں انگڑائیاں

معنیٔ بے لفظ کی شرحِ دل آویز و خموش
جرأتِ پنہاں کی بیتابی، تمنّا کا خروش

خون کی گردش میں رہ رہ کر برنگِ زیر و بم
حوصلوں کی بیقراری، ولولوں کا پیچ و خم

جوئے طوفاں خیز کے سانچے میں ڈھلنے کی اُمنگ
بھینچ کے آغوشِ تمنا میں مچلنے کی اُمنگ

دست و پا کے لوچ میں اُس حرفِ مبہم کا ظہور
نُطق کی پرواز سے ہے آشیانہ جس کا دُور

خال و خد کی نغمہ ریزی، ابروؤں کی گفتگو
نرگسِ مخمور میں طغیانِ شرحِ آرزو

جذبۂ بیدار کا پالا ہوا خوابِ گراں
جنبشِ مژگاں کی گویائی اشاروں کی زباں

ایک ایسا ساز، مابینِ یقین و اشتباہ
پا سکے جس کو نہ کان اور سن سکے جس کو نگاہ

جوشؔ! بس خاموش ہو پیمانہ بھرنے دے مجھے
جھوم کر بربط اُٹھا اور رقص کرنے دے مجھے

مجنوں

سرد پیشانی پہ ہلکا سا ہی اک ابرِ سیاہ
ڈالئے مجنوں کے چہرہ پہ اک گہری نگاہ

کیا خبر، اس کے دماغِ مضطرب میں ٹوٹ کر
ہو چکی ہیں کس قدر باریکیاں باریک تر!

ہر نفس رہتے ہیں بیداری پر اسکی بے نقاب
کس قدر الجھے ہوئے ناقابلِ تعبیر خواب!

اس کے ابر آلود خال و خد میں رہتے ہیں رواں
کتنے نامعلوم مبہم وسوسوں کے کارواں!

کتنے معنی حیرتِ الفاظ میں ڈوبے ہوئے
جھانکتے رہتے ہیں اس کے دیدۂ بیخواب سے!

اس کے سینے میں ہیں، جیسے راگنی کے زیر و بم
کتنی غم انگیز خوشیاں، کتنے دل آویز غم!

حسرتیں اسکی ہیں مرجھائی ہوئی کھلتی ہوئی
صبح گرما کے پریشاں ابر سے ملتی ہوئی

روح اسکی کاہشِ پیہم کی ٹھکرائی ہوئی
پُرفشاں ہے مشتعل آنکھوں میں گھبرائی ہوئی

شورشوں کے باوجود اسکے لئے دن ہو کہ رات
ایک لامحدود سناٹے میں گم ہے کائنات

اس کا اندازِ تنفس، اس کا طرزِ قال و قیل
چور کی آہٹ سے جیسے چونک اٹھے کوئی بخیل

گامزن ہے یوں ٹہلتا، سوچتا، گاتا ہوا
مرغِ وحشی جس طرح کہرے میں منڈلاتا ہوا

اسکی نظروں میں ہے یوں شمشیرِ وحشت بے نیام
جیسے دینا چاہتا ہو کوئی طوفان پیام

کتنے پنہاں شوق، کتنے نیم پیدا ولولے
پھر رہے ہیں اسکے ویراں ذہن میں بھٹکے ہوئے!
رنگ ہے اس کا کبھی کھلتا، کبھی اُڑتا ہوا
دل کسی نادیدہ صحرا کی طرف مڑتا ہوا
فکر کو رہ کے مشعل سی دکھاتا ہے کوئی
اِسکی آنکھوں میں اشاروں سے بلاتا ہے کوئی

فریبِ نظر

زمیں پہ رَوندی ہوئی پڑی ہے، جو دل کا غنچہ کھلا رہی تھی
ارے کلی کو یہ ہو گیا کیا؟ ابھی تو یہ مُسکرا رہی تھی
بتاؤ اے شعلہ خو شعاعو! یہ رنگ کیا ہو گیا چمن کا؟
ابھی تو یاں بادِ صبح گاہی، گلوں کو جھولا جھلا رہی تھی
نظر اٹھی تو گلاب دیکھا، پلک جو جھپکی تو خار پایا
سُنا کہ فصلِ گل آ رہی ہے، چمن میں پہنچے تو جا رہی تھی
صدائیں آئیں کہ پشت سے وہ نسیم فردوس آ رہی ہے
پلٹ کے دیکھا تو بادِ صرصر فضا میں پرچم اُڑا رہی تھی
بڑھے لپکتے ہوئے خوشی میں دکھایا دریا جو تشنگی نے
قریب پہونچے تو ریگِ صحرا شعاعوں سے جگمگا رہی تھی
اٹھی جو میداں میں گردِ پیہم، اٹھے کہ لیلیٰ کی ہے سواری
گئے امیدیں لئے تو دیکھا، ہوا بگولے اُڑا رہی تھی
اُڑا جو پردے کا ایک گوشہ، نظر پڑا در پہ اُن کا جلوا
جو گھر سے باہر نکل کے دیکھا، صبا دریچے ہلا رہی تھی
اُداس جنگل میں نور دیکھا کہ موجزن ہے قریبِ دریا
بڑھے تو اک نوجوان بیوہ چتا کی سرخی بڑھا رہی تھی

نظر نے دیکھا کہ شوخ تتلی فضا میں پرواز کر رہی ہے
نگہ جمائی تو زرد پتی ہواؤں میں تھرتھرا رہی تھی

تجلیوں کے مشاہدہ سے نگاہ اب میری پھر گئی ہے
نظر نے اتنے دیئے ہیں دھوکے، بصارت آنکھوں سے گر گئی ہے

داغِ جگر بیچتا ہوں

لیتو! میں داغِ جگر بیچتا ہوں
بہ نرخِ خزف تاجِ زر بیچتا ہوں

جہاں سنگریزوں پہ گرتے ہیں گاہک
وہاں جنس لعل و گہر بیچتا ہوں

جہاں قدرداں جمع ہیں تلخیوں کے
وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہوں

جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں
وہاں موجِ گلہائے تر بیچتا ہوں

پرستاریاں ہیں جہاں ظلمتوں کی
وہاں نورِ شمس و قمر بیچتا ہوں

جہاں دردِ دل کا مخالف ہے عالم
وہاں دردِ دل کا اثر بیچتا ہوں

جہاں جستجوئے سکونِ حضر ہے
وہاں آرزوئے سفر بیچتا ہوں

جہاں سات پردوں میں رہتی ہے جرأت
وہاں جذبۂ پردہ در بیچتا ہوں

جہاں پستیِ بام و در ہے گوارا ! — وہاں رفعتِ بام و در بیچتا ہوں

جہاں ہر کبوتر ہے قانع قفس میں — وہاں دولتِ بال و پر بیچتا ہوں

جہاں برف و شبنم سے وابستگی ہے — وہاں ذوقِ برق و شرر بیچتا ہوں

جہاں دست و پا شل ہیں پسپائیوں سے — وہاں تیغِ فتح و ظفر بیچتا ہوں

جہاں ترکِ یک مُو بھی ممکن نہیں ہے — وہاں خواہشِ ترکِ سر بیچتا ہوں

جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے — وہاں وسعتِ بحر و بر بیچتا ہوں

چُھپا کر ردیف و قوافی کے اندر — میں، دل بیچتا ہوں، جگر بیچتا ہوں

گدا ہوں، مگر وہ گدائے غنی دل — کہ، تاج و کلاہ و کمر بیچتا ہوں

صدا دو، کہ بازارِ نوعِ بشر میں — تمنّائے روحِ بشر بیچتا ہوں

نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت — کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں

کوئی مُشتری ہو تو آواز دیدے — میں کمبخت، جنسِ ہُنر بیچتا ہوں

سخن کے ہیں یوں تو بہت جوش تاجر
مگر، میں، بہ رنگِ دِگر بیچتا ہوں

فریبِ ہستی

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی
کہ گھُٹ کے آرزوئے تخمِ گل نہ رہنے پائے

مٹا کے نقشِ دوئیِ صیدِ رنگ و بو کیلئے
مہین جال سے بُن کر زمیں کی تہ میں بچھائے

کثافتوں میں لطافت کی شمع روشن کی
نمو کے ظلمتِ افسردہ میں چراغ جلائے

گھٹا کی جیب تہی تھی، فضا پہ ڈالے دام
قدم پہ شمس کے تڑپی، قمر کے ناز اٹھائے

گذشتہ زہرہ جبینوں کے، دل نشیں ذرات
نفس کی لو پہ پڑے اہتمام سے پگھلائے

دیئے گئے تھے نباتات کو جو روزِ ازل
کمالِ حسن و لطافت سے وہ سبق دہرائے

جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہِ فلک
جمودِ زیرِ زمیں کو تپش کے راز بتائے

تری زمین سے لی، آسمان سے گرمی
صبا سے عطر نچوڑا، کرن سے رنگ چرائے

بھگو کے رنگ میں ذرات کی بناتیں تھیں
اور ان تہوں میں تکلف کے ساتھ نقش بٹھائے

گرہ لگائی پھر اک، مثلِ نرگسِ مخمور
اور اس طرح کہ ہواؤں کی زد میں کُھلتی جائے

اور ان تمام مراحل کے بعد - ایک کلی چمن فروز ہوئی پتیوں سی منہ کو چھپائے

اور اس کے بعد جو دیکھا تو شام کے ہنگام

پڑی ہوئی تھی سرِ خاک، ناوکِ غم کھائے

یہ کیا نظام ہے معبود! باغِ ہستی کا! کھلے جو صبح کو، وقتِ غروب کُھلا جائے

جب ایک پل میں ہو تعمیرِ ماہ و سالِ خراب تو کس امید پہ کوئی فریبِ ہستی کھائے؟

بیا کہ قصرِ امل سخت سُست بنیاد است

بیار بادہ، کہ بنیادِ عمر بر باد است

(حافظ)

ہستیٔ بیتاب

سکوں نہ ڈھونڈھ کہ صبحِ ازل سے ہے ابتک ضمیرِ ارض و سما، روحِ مرد و زن بیتاب

کوئی اُدھر ہے پریشاں قبائے زر کے لئے کسی کے دل میں اِدھر حسرتِ کفن بیتاب

نگاہِ ناز میں ہے حرفِ دلبری بے چین زبانِ شوق میں ہے شعلۂ سخن بیتاب

صدائے نَے سے اُدھر مست، ساقیٔ نوخیز ہوائے گُل سے اِدھر بادۂ کہن بیتاب

اُدھر ترانۂ مطرب سے، بزم زیر و زبر
اِدھر حسام کی جھنکار سے ہے رَن بیتاب

اُدھر کشاکشِ گیسو سے ہر دل آشفتہ
اِدھر نسیم سے گیسو کی ہر شکن بیتاب

اُدھر سیاستِ خورشید سے بیاباں گرم
اِدھر سحابِ جنوں خیز سے چمن بیتاب

اُدھر گدازِ چراغِ حرم سے شیخ کو وجد
اِدھر فروغِ رُخِ بُت سے برہمن بیتاب

اُدھر خلوص کے دل میں عقیدتیں بےچین
اِدھر نفاق کے سینے میں سوءِ ظن بیتاب

اُدھر نہیبِ رقابت سے مضطرب خُسرو
اِدھر فریبِ محبت سے کوہ کن بیتاب

اُدھر وصال میں زلفِ نگار ژولیدہ
اِدھر فراق میں بستر کی ہر شکن بیتاب

اُدھر تمرّدِ انساں سے سرگراں یزداں
اِدھر شکوۂ مشیّت سے اہرمن بیتاب

اُدھر تجلّیِ اصنام، لرزہ بر اندام
اِدھر نہیبِ محمودِ بُت شکن بیتاب

اُدھر پسر کے لیے چشمِ کور گرمِ تلاش
اِدھر پدر کے لئے بوئے پیرہن بیتاب

اُدھر ہے قامتِ پیری پہ زہ کمانِ قضا
اِدھر کلاہِ جوانی میں بانکپن بیتاب

غرض کہ، شرح کہاں تک ہو، مختصر یہ ہے
کہ انجمن کی ہے، اے جوشؔ! انجمن بیتاب

بھٹکی ہوئی نیکی

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے، راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالمِ سعی و کاوش میں انساں کیلئے آرام نہیں

چھائی ہے فضا پر تشنہ لبی مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے ہر روح میں اک بیتابی ہے

اس بزمِ خلش کا ہر ذرّہ، بے چینیوں کے انبوہ میں ہے
اک رعشۂ پیہم کاہ میں ہے، اک لرزش پنہاں کوہ میں ہے

لیلائے سماعت مضطر ہے، عشرت کے ترانے سُننے کو
ہر نقص کا دامن پھیلا ہے تکمیل کی کلیاں چُننے کو

ہیجان ہے چشمِ پستی میں، رفعت کا نوشتہ پڑھنے کا
اک دُھن ہے ترقی کرنے کی ۔ اک جوش ہے آگے بڑھنے کا

ہر موم کو دُھن ہے شمع بنے، مضطر ہے پگھل جانے کیلئے
ہر سنگ کا سینہ جلتا ہے پارس میں بدل جانے کیلئے

انگاروں پہ شعلے لوٹتے ہیں، بجلی پہ تفوق پانے کو
چنگاریاں مرغِ بسمل ہیں تاروں کی جگہ کھل جانے کو

بے چین بگولا رقصاں ہے، آندھی پہ شرف پانے کیلئے
جو موج ہے پیچ و تاب میں ہے دھارے سے اُلجھ جانے کیلئے

ہر قطرۂ دریا غلطاں ہے موتی پہ تسلط پانے کو
ہر ذرّۂ خاکی اڑتا ہے خورشید سے ٹکّر کھانے کو

ہر دل میں، غرض اک کاوش ہے، امید کا ساغر بھرنے کی
ہر شے کی تڑپتی فطرت میں، خواہش ہے ترقّی کرنے کی

ہر لمحہ یہ خواہش روحانی، جذبوں کو اُبھارا کرتی ہے
میدان کے تپتے ذرّوں کو سورج سے پکارا کرتی ہے

وہ چور جو شب کے پردے میں سرقے کی غرض سے آتا ہے
جو نیند کی ماتی بستی پر ظلمت کی طرح چھا جاتا ہے

اک ایسی ہی خواہش اسکو بھی، چوری کیلئے اکساتی ہے
جس طرح کی خواہش نورانی، دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے

سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح تسکین و طرب کا جویا ہے
ہر چند کہ اس نے قسمت سے تسکین کا رستہ کھویا ہے

رہبر ہو کہ، رہزن دونوں میں تسکین کی خواہش یکساں ہے
ہر چند وہ سیدھی راہ پہ ہے، یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے

عارف نے یہ سمجھا آسائش شکوں کو گرا کر ملتی ہے
قاتل نے یہ سمجھا انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے

صوفی نے یہ سمجھا وہ دل کے پیمانہ میں مل جائے گی
میکش کی سمجھ میں یہ آیا میخانے میں مل جائے گی

پس ذوقِ طرب میں جو انساں رہتا ہے سدا میخانوں میں
ہے اصل میں وہ بھی دُنیا کے معصوم ترین انسانوں میں

جال اس پہ نہ ڈال اے صید فگن، یہ بامِ حرم کا طائر ہے
آیا ہے بھٹک کر دیر میں جو گمراہ نہیں ہے، زائر ہے

جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں، خواہش ہی کے زیرِ فرماں ہیں
ہر جرم کے سینہ محضر پر خواہش ہی کی مہریں تاباں ہیں

المختصر، ان تشریحوں سے، ہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے
کہتے ہیں جسے دُنیا میں "بدی" بھٹکی ہوئی وہ اک "نیکی" ہے

مشاہدات

ہر نفس، یہ کس کے جلووں کی خبر پاتا ہوں میں
شکر کے سجدوں میں بینائی کا سر پاتا ہوں میں

منظرِ ہستی پہ تابندہ یہ ہے کس کا جمال ؟
خیرہ پہنائے دو عالم کی نظر پاتا ہوں میں

سامنے آتی ہیں جب صبحیں برافگندہ نقاب
دل میں یہ کس کے تبسم کا اثر پاتا ہوں میں

ہر کلی میں دیکھتا ہوں ایک چشمِ نیم باز
ہر چمن کو اک بہشتِ مختصر پاتا ہوں میں

ایک اک پتہ ہے مکتوبِ عروسِ رنگ و بو
باغ میں ہر شاخ کو پیغامبر پاتا ہوں میں

چرخ پر ایک ایک تارے میں جھلکتا ہے جمال
خاک کے ایک ایک ذرّے میں نظر پاتا ہوں میں

نقطہ ہائے نور پر ہیں تیرگی کے دائرے
ظلمتوں میں گردشِ شمس و قمر پاتا ہوں میں

خاک کے تودوں پہ ہے معمارِ عالم کی نگاہ
ہر قدم پر ساز و برگِ بام و در پاتا ہوں میں

کانپنے لگتے ہیں جب تارے بساطِ چرخ پر
عالمِ اسباب کو زیر و زبر پاتا ہوں میں

ناخنِ غم چھیڑتا ہے جب رگِ جاں کا ستار
دل میں لیلائے طرب کو جلوہ گر پاتا ہوں میں

جلوہ گاہِ ناز میں جس وقت رکھتا ہوں قدم
اس گرہ کو حلقۂ بیرونِ در پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں جسقدر گہری نظر سے بار بار
حسن کو پہلے سے کچھ پاکیزہ تر پاتا ہوں میں

ہر نظر، رخ پر دکھاتی ہے اک آب و تابِ نو
ہر نفس جلوؤں میں اک شانِ دگر پاتا ہوں میں

ثبت ہے تصویر کے رخ پر مصور کا جمال
آئینے میں جلوۂ آئینہ گر پاتا ہوں میں

دوڑتا ہے نبضِ خس میں برقِ سوزاں کا لہو
سینۂ شبنم میں طوفانِ شرر پاتا ہوں میں

اشتیاقِ اوج میں ہیں نا تراشیدہ صنم
پتھروں میں جنبشِ صد بال و پر پاتا ہوں میں

ناخنِ حکمت پہ کرتا ہوں بھروسا جس قدر
عقدۂ اسرار کو پیچیدہ تر پاتا ہوں میں

تہہ میں کیا جلوے ہیں انکی شرح تو ممکن نہیں
سطحِ دریا پر بھی اک موجِ گہر پاتا ہوں میں

دل میں جب آتا ہے صانع کے مصالح کا خیال
عیب کی فطرت کو لبریزِ ہنر پاتا ہوں میں

بستۂ یک آرزوئے مشترک ہے کائنات
کس قدر اضداد کو شیر و شکر پاتا ہوں میں

راہِ حق ہی میں نہیں ہیں حسن کے نقشِ قدم
گمرہی کو بھی کسی کی رہ گذر پاتا ہوں میں

پھر تعجب کیا، کہ اس تر دامنی کے باوجود
جوشؔ کو منجملۂ اہلِ نظر پاتا ہوں میں

بارگاہِ شعر

یہ بارگاہِ شعر ہے، جھکتے ہیں سر یہاں
قطعِ نظر سے ہوتی ہے پیدا نظر یہاں

چومی ہے نخوتوں نے یہ خاکِ فتادگی
ڈالی ہے رفعتوں نے فلک کی سپر یہاں

اس راستے کی شمع ہے روح الامیں کی سانس
روشن کبھی ہوا نہ چراغِ سحر یہاں

اس کشورِ فراق کی مدہوشیاں نہ پوچھ
شاہوں سے، فاقہ مست ہیں آسودہ تر یہاں

گونجی ہوئی ازل سے ہے گلبانگِ بے خودی
یعنی، حدیثِ عقل نہیں معتبر یہاں

معمورۂ خیال میں ہنگامِ ناؤنوش
کرتے ہیں رقص زہرہ وش و سیمبر یہاں

پڑتی ہے آ کے قلب پہ حُسنِ ازل کی ضرب
آئینہ توڑ دیتا ہے آئینہ گر یہاں

اللہ رے سرود کہ اجزائے کائنات
ہر زیر و بم پہ ہوتے ہیں زیر و زبر یہاں

اس دائرے میں منصبِ کام و دہن ہے اور
تلخی میں بھی ہے دولتِ شہد و شکر یہاں

ہاتھوں پہ صبح کو طبقِ زر لیے ہوئے
آتے ہیں آسمان سے پیغامبر یہاں

باطل، فسانۂ کرۂ ارض و دورِ چرخ
یہ دائرے ہیں حلقۂ بیرونِ در یہاں

پروانہ معرفت کا ہے دل کی شکستگی
پیغمبری کی مُہر ہے داغِ جگر یہاں

ہوتے ہیں نورِ صبح سے تعمیر سقف و بام
بنتے ہیں رنگِ شام سے دیوار و در یہاں

اُڑتی ہے سوئے چرخِ بریں کو روحِ شوق
ہوتی ہیں آسمان پہ راتیں بسر یہاں

ہر ذرۂ حقیر بصد ناز و دلبری
رکھتا ہے آفتاب کے زانو پہ سر یہاں

کیا پوچھتا ہے جوشؔ تصوّر کے معجزے
ہر سانس میں ہے ارض و سما کا سفر یہاں

ہم لوگ

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ
مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

ہر ایک سانس ہے گو صد ہزار حشر بدوش
مگر پیامِ ثبات و قرار ہیں ہم لوگ

جلال چھو نہیں سکتا ہے بادو باراں کا
وہ دستِ غیب کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ

زمیں سے کرتے ہیں ناز اور آسماں سے غرور
وہ کبرِ دوست کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ

عیاں ہیں جن پہ تہی دستیاں سلاطیں کی
لباسِ فقر میں وہ شہر یار ہیں ہم لوگ

جہاں میں ہیں مگر اہلِ جہاں سے کام نہیں
وطن میں رہ کے غریب الدیار ہیں ہم لوگ

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار ہمیں
مثالِ جوئے رواں بیقرار ہیں ہم لوگ

جو اپنیوں کو ہمیں سے ملی ہے نعمتِ ناز
وہ رازِ طرۂ زلفِ نگار ہیں ہم لوگ

فسردۂ غمِ ہستی سے کھینچتے ہیں شراب
بساطِ عیش پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ

چمن میں سنتے ہیں ہر صبح نغمۂ الہام
امینِ زمزمۂ شاخسار ہیں ہم لوگ

جگر ہے وقت کا اپنی جناب میں صد چاک
وہ فاتحِ غمِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ

حیات و موت کی پست و بلند راہوں میں
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

نفس میں سنتے ہیں آہٹ کسی کے قدموں کی
نہ پوچھ، کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

وہ جبر دوست جسے "اختیار" کہتے ہیں
اس اختیار سے بے اختیار ہیں ہم لوگ

محیطِ سکۂ مقلوب کے طلاطم میں
سفینۂ زرِ کامل عیار ہیں ہم لوگ

حیات کی ابدی رات کے اندھیرے میں
چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہیں ہم لوگ

بجھے پڑے ہیں زمانہ کے ہات سے ہر چند
مگر ہمیرِ برق و شرار ہیں ہم لوگ

ادب سے آؤ ہمارے حضور اہلِ نظر!
جہانِ حسن کے پروردگار ہیں ہم لوگ

نگاہ روبرو، اے روحِ نعمتِ دارین
بہ ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

بس اس خطا پہ کہ ہیں محرمِ رموزِ حیات
شکار کشمکشِ روزگار ہیں ہم لوگ

تحفہ

اے روحِ عصرِ حاضرِ ہندوستانِ نو — لایا ہے اک صحیفہ، سخنداں ترے لئے

اس مصحفِ عظیم کی اللہ رے وسعتیں — ہر مد ہے مشرقین بداماں ترے لئے

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے — چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لئے

رکتی ہے جس مقام پہ روح الامیں کی سانس — دل کو وہاں کیا ہے پر افشاں ترے لئے

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے — یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

کتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل — پرکھی ہے روحِ عالمِ امکاں ترے لئے

اس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن — کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لئے

ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں — کتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں خبر بھی ہے — کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لئے

کس کو خبر تراش کے کن ظلمتوں کا دل — لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل — کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لئے

واقف بھی ہے کہ موج سخن میں ہوئی ہے صرف — کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لئے

لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں کیا کہوں — کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے

تعبیر کی ترازوئے نرم و نہفتہ میں — تولے ہیں کتنے خوابِ پریشاں ترے لئے

کیا پوچھتا ہے جوشؔ کی بربادیوں کا حال

پُرزے ہے کب سے جیب و گریباں ترے لئے

آوازِ شاعر

میں زمیں پر مصحفِ احساس کی تفسیر ہوں — عشق کی تنویر، خوابِ حُسن کی تعبیر ہوں

جو دو عالم کی حدیں جکڑے ہے وہ زنجیر ہوں — میں ستاروں کی زباں ہوں، چاند کی تقریر ہوں

میری نظمیں روشنی ہیں قلبِ حق آگاہ کی

یہ سُنہری کنجیاں ہیں قصرِ مہر و ماہ کی

شہد میری گفتگو ہے، سانس ہے میری گلاب — نطق سے میرے نمایاں ہے تخیل کا شباب

پیکرِ خاکی ہوں، لیکن وہ طلسمِ آب و تاب — جس کے ہر ذرہ میں گردش کر رہا ہے آفتاب

ڈالتا ہوں پرتوِ گلشن خس و خاشاک پر
عرش کی مُہریں لگاتا ہوں جبینِ خاک پر

وارثِ کونین ہوں میرا کوئی ثانی نہیں
میرے قدموں پر جھکی رہتی ہے فطرت کی جبیں
مسکراتی ہے غرورِ عرش پر میری زمیں
ظالم و سرکش عناصر ہیں مرے زیرِ نگیں

رقص کرتا ہے نظامِ دہر میرے ساز پر
کاروانِ روح چلتا ہے مری آواز پر

ناز سے گلشن میں چلتی ہے ہوا میرے لئے
جُھوم کر آتی ہے ساون کی گھٹا میرے لئے
حُسن کو بخشے گئے ناز و ادا میرے لئے
ساز سے باہر نکلتی ہے صدا میرے لئے

صبح کے رنگین غنچوں میں ترنم مجھ سے ہے
چاندنی راتوں میں اندازِ تبسم مجھ سے ہے

صبح کو غنچوں میں در آتی ہے جب پہلی کرن
مجھ سے شبنم کی زباں ہوتی ہے سرگرمِ سخن
چاندنی میں جب جھلک اُٹھتا ہے برگِ یاسمن
عشق ہوتا ہے مری محفل میں صدرِ انجمن

زمزمے سُنتا ہوں شب کی محفلِ خاموش میں
حُسن آجاتا ہے تاروں سے مرے آغوش میں

سرد ہو جائیگی جب یاروں کی قندیلِ دماغ
تیرگی میں اور بھی چمکیں گے میرے دل کے داغ



عصرِ حاضر کا زمانہ جب لگائے گا سُراغ　　دور سے جلتا نظر آئیگا شاعر کا چراغ

رات جب تاریک ہوگی، برق چمکاؤں گا میں

اک منارہ نور کا اس وقت بن جاؤں گا میں

پرچمِ تعمیرِ نو جب چرخ پر لہرائے گا　　عصرِ پارینہ کے ایواں کا کلس تھرّائیگا

انقلابِ دہر تاج و تخت کو ٹھکرائے گا　　ایک میرا نقش ہے دُنیا میں جو رہجائیگا

مشعلوں کو جب بُجھا دیگی ہوا آفاق میں

یہ کنول روشن رہیگا آندھیوں کے طاق میں

سوزِ ناتمام

اے نوا سیرِ کاکلِ ہنگامۂ نشاط!　　عالم اگرچہ عالمِ اوہام و خواب ہے

مانا، کہ کائنات ہے، محض ایک اعتبار　　دریا نہیں، فریبِ نمودِ سراب ہے

پھر بھی نگاہِ اہلِ حقیقت کے واسطے　　ہر ذرّہ، اک ضمیمۂ اُمّ الکتاب ہے

یاں ایک بھی عمل نہیں بے ربط و سلسلہ　　جو چیز ہے، وہ اپنی جگہ لاجواب ہے

صرف اک حقیر خاک کی نیرنگیوں کو دیکھ — صحرا میں خار، صحنِ چمن میں گلاب ہے
سُن، اے حریفِ بادۂ انگور و بزمِ کیف — فطرت کے میکدے میں حقیقی شراب ہے
دیکھ اس طرف، کہ جامِ طلوع و غروب میں — صہبائے روز، ابر و شبِ ماہتاب ہے
لہروں کو چھوڑ، بحر کو گہری نظر سے دیکھ — گوہر کے رُخ پہ موج کی چادر، نقاب ہے
دھوکا ہے یہ نگاہ کا، اللہ باز آ ! — جس کو سمجھ رہا ہے تجلی، حجاب ہے
جس حسنِ دلفریب پہ یوں دُھن رہا ہے سر — تیری ہی بے خبر، یہ نگاہِ شباب ہے
بیگانۂ حقیقتِ انفاس، ہوشیار ! — ہر سانس ایک عالمِ صد انقلاب ہے
ہر جنبشِ نگاہ ہے اک انقطاعِ فصل — ہر لمحہ، ایک منزلِ روزِ حساب ہے
جی بھر کے بزمِ عیش میں ارماں نکالنا — اوچھا سا اک خیال، پریشاں سا خواب ہے
صد گرمئ حیات ہے اک سوزِ ناتمام — جب شمع جل بجھی نہ تپش ہے نہ تاب ہے

حسرت نکل گئی تو ہے ناکامیاب دل
حسرت مچل رہی ہے تو دل کامیاب ہے

تحسین کے پھول

رات کے ہنگام جب ہوتا ہے اک عالم خموش
بادِ خواب آور سے جل اٹھتی ہیں یاں قندیلِ ہوش

کھولتی ہے اپنے شہپر جب سہیلی موت کی
دوڑ جاتا ہے مری نبضوں میں خونِ زندگی

کاروانِ کش مکش ہوتا ہے جب مصروفِ خواب
ہنس کے میرے دل کی بیداری الٹتی ہے نقاب

کوئی پُراسرار قوت، کوئی روحِ محتشم
شعر کہنے کو مرے ہاتھوں میں دیتی ہے قلم

دفعتہً چھڑتے ہیں پھر ارض و سما کے زمزمے
اک کرن سی دائرہ میں گھیر لیتی ہے مجھے

دل میں ہوتا ہے مرے نادر خیالوں کا ہجوم
مسکرا کر دیکھنے لگتے ہیں گردوں سے نجوم

بہرِ پابوسی فرشتوں کو صدا دیتا ہوں میں
آسماں کو اپنے قدموں پر جھکا لیتا ہوں میں

لکھ رہا ہوں کیا، نہیں ہوتی مجھے مطلق خبر
انگلیوں پر اک جلالی شان آتی ہے نظر

یوں قلم کرتا ہے جنبش ہات میں بے اختیار
اک طرب آمیز دہشت دل کے چھو لیتی ہے تار

یوں فضا میں نقش ابھر آتے ہیں تھرّائے ہوئے
جس طرح ساحر کے لب، افسوں کو دہرائے ہوئے

کس قدر اسرار سے معمور ہیں جلوے ترے
اے تحیّر خیز جلوے لیلیٰ تخئیل کے

شب کو تیری قربتِ الہام پرور کا یقیں
کھولتا ہے دل میں قفلِ آسماں، بابِ زمیں

تو پری ہو یا فرشتہ، روح ہو یا واہمہ
آ کسی دن میرے آگے شکلِ انسانی میں آ

تا کہ میں وہ شہد بار الفاظ وہ شیریں فضا
پنکھڑی سے وہ تبسم، وہ صدائیں دلکشا

روح پرور وہ صلے، وہ 'مرحبا' کی زمزمے
جو بطورِ داد پائے ہیں مرے اشعار نے

سر عقیدت سے جھکا کر اے نہفتہ غم گسار
ڈال دوں گردن میں تیری گوندھ کر ان سب کا ہار

خطِ رفتار

دیکھ چشمِ غور سے، راہوں میں قدموں کے نشاں
یہ لکیریں ہیں کہ جنبش میں ہے نبضِ کارواں

بعض نقشِ پا ہیں، کچھ سمٹے ہوئے سے مضمحل
جن سے ظاہر ہے کہ تھے پژمردہ ان لوگوں کے دل

اور کچھ ابھرے نظر آتے ہیں فرشِ خاک پر
لے رہا ہے جن میں انگڑائی غرورِ مال و زر

کچھ نشاں ہیں ہلکے ہلکے دلفریب و دل نشیں
جن سے ثابت ہے کہ یہ رہرو تھے شاید نازنیں

کچھ نشاں ایسے بھی ہیں پامالِ بارِ آرزو
جن کے ہر خط میں تپرافشاں ہے تمنا کا لہو

کچھ نشاں ایسے ہیں گویا خون سارا جم گیا
فرطِ ناکامی سے دل دھڑکا دھڑک کر تھم گیا

بعض میں آمادگی ہے مسکرانے کے لئے
اور کچھ بے چین ہیں آنسو بہانے کے لئے

کچھ ہیں یوں زیروزبر، نغمے کے جیسے زیر و بم
جن سے ثابت ہے، کہ یہ شاعر کے ہیں نقشِ قدم

اے مسافر دیکھ شانِ پیچ و تابِ زندگی
یہ نشانِ پا ہیں، اوراقِ کتابِ زندگی

حرف ہیں ذرّوں کے، دفترِ راہِ ناہموار کا
لکھ گیا ہے خاک پر کیا کیا قلم رفتار کا!

دیدۂ احساس میں تسبیح کے دانے ہیں یہ
بزم گاہِ جادۂ ہستی کے افسانے ہیں یہ

بازیٔ غیب

اے شوخ دل سے تیری شوخی کو مانتا ہوں — اکسیر آج اگر ہوں، کل خاک چھانتا ہوں

تو کھیلتا ہے مجھ سے میں خوب جانتا ہوں

گھٹ کر کبھی ہوں قطرہ، بڑھ کر کبھی ہوں دریا — آج ابتدا کا جلوہ، کل شانِ انتہا ہوں

تو کھیلتا ہے مجھ سے میں خوب جانتا ہوں

عصیاں کی گھاٹیوں میں طوفاں ہوں تیرگی کا — عصمت کے آسماں پر، خورشیدِ حق نما ہوں

تو کھیلتا ہے مجھ سے، میں خوب جانتا ہوں

آج، آفتابِ عزت، کل ذرۂ حقارت — آج آشنائے صحت کل دردِ لادوا ہوں

تو کھیلتا ہے مجھ سے، میں خوب جانتا ہوں

میرا بھی کوئی جلوہ، آندھی کی زد پہ شعلہ — میری بھی کوئی ہستی، دم بھر میں کیا سے کیا ہوں

تو کھیلتا ہے مجھ سے، میں خوب جانتا ہوں

اک عمر ہو چکی ہے، یوں ہی مجھے سلگتے — اک آنچ کی کسر ہے، اکسیر ہو چلا ہوں

تو کھیلتا ہے مجھ سے ، میں خوب جانتا ہوں

جنازہ

دیکھ اے انساں! یہ کیا شے جا رہی ہے دوش پر؟
ہاں، خدارا اک نظر، اس پیکرِ خاموش پر

کون یہ اوڑھے کفن، تا حشر سونے کیلئے
جا رہا ہے قبر کی خوراک ہونے کے لئے

اشک بن کر نور کیوں اس کی نظر کا بہہ گیا
سوچ، یہ کیوں دفعتہً خاموش ہو کر رہ گیا

تجھ سے کچھ اس خاک کی امداد ہو سکتی نہیں؟
اب یہ بستی حشر تک آباد ہو سکتی نہیں

ناز تھا جس صبحِ نورانی پر اس کی شام دیکھ
دیکھ اپنے شاندار آغاز کا انجام دیکھ

بے خبر، یوں سو رہا ہے آج جو اوڑھے کفن
ایک دن اس نے بھی پہنا تھا عروسی پیرہن

اس کی راتیں بھی تبسم کی طرح شاداب تھیں
اس کے دل میں بھی ہزاروں حسرتیں بیتاب تھیں

خون میں اسکے بھی اک ہلچل تھی، اک طوفان تھا
یہ بھی تیری طرح، جیتا جاگتا انسان تھا

وہ امنگیں، وہ نشاطِ کامرانی کیا ہوئی
کیا ہوئی، وہ زندگی کی لن ترانی کیا ہوئی

تو آبِ خوشگوار، میں "صہبائے قوم" ہوں
تو "فکرِ قوم" ہے، میں "تمنّائے قوم" ہوں
تو باغباں ہے اور مری ذات باغ ہے　　میں دل ہوں اپنی قوم کا اور تو دماغ ہے
وہ دل ہوں جس میں سُرخ محبّت کے داغ ہیں
ہر داغ پر نثار ہزاروں دماغ ہیں

فسونِ آرزو

جس دن سے جبہ سا ہوں میں دل کے آستاں پر
ہر جنبشِ نظر سے اُڑتا ہوں آسماں پر
روحِ شراب یعنی، آنسو پیئے ہوئے ہوں
کونین کی امانت دل میں لئے ہوئے ہوں
کرتا ہوں چاک صدہا پردوں کو ہر نفس سے
گلشن پہ ضو فشاں ہوں تاریکیٔ قفس سے
جیسی ہے میری دُنیا، ویسی کہیں نہیں ہے
اوپر فلک نہیں ہے، نیچے زمیں نہیں ہے
شرما کے ماہِ تاباں، منہ اپنا ڈھانپتا ہے
میرے پروں کا سایہ تاروں پہ کانپتا ہے
ادوارِ برق رَو کا مجھ پر اثر نہیں ہے
میرے لئے نظامِ شمس و قمر نہیں ہے

لیلائے سرمدی سے میری نظر لڑی ہے
زنجیرِ بے ثباتی، ٹوٹی ہوئی پڑی ہے
سجدے کریں فرشتے، میری وہ آبرو ہے
اور کیوں نہ ہو کہ میرے دل میں وہ آرزو ہے
جس کا فسوں نہ جانے کس کس پہ چل چکا ہے
غش کھا چکے ہیں موسیٰ اور طور جل چکا ہے

کون ہے

کون کہنا چاہتا ہے مجھ سے اپنے دل کا راز
یہ ہواؤں میں ہے کس کے سانس لینے کا گداز؟
کس کا سایہ کانپتا ہے یہ در و دیوار پر
جھانکتا ہے کون ظلمت کا دریچہ کھول کر؟
یہ مرے سینے میں، اے شب سسکیاں لیتا ہے کون؟
یہ اندھیرے میں مجھے پیغام سا دیتا ہے کون؟
کس سے میں پوچھوں یہ کیا انداز، یہ کیا طور ہے؟
خود یہ دل ہی کے کرشمے ہیں کہ کوئی اور ہے؟

شاعر کا دل

کبھی دل فخر سے دیتا ہے آواز
کہ اک تنکے سے ہلکا آسماں ہے

کبھی فریاد کرتا ہے کہ مجھ پر
نفس کا ثقل بھی کوہِ گراں ہے

کبھی ہر ذرۂ خاکی کا محکوم
کبھی شمس و قمر پہ حکمراں ہے

کبھی ہے کامراں ہو کر بھی ناکام
کبھی ناکام ہو کر کامراں ہے

کبھی لطفِ خداوندی سے مغموم
کبھی جورِ بتاں سے شادماں ہے

کبھی مژگاں کی جنبش سے کہن سال
کبھی صدیوں کی کاوش سے جواں ہے

سُن اے غافل! کہ جس دل کے ہیں یہ طور
وہ دل، ہم شاعروں کا آشیاں ہے

دماغوں پر کھُلیں ہم کیا، کہ ہم کو
وہ سمجھے گا جو دل کا رازداں ہے

معذرت

ہنسا میں اور زمانہ کی خوشی کا چڑھ گیا پارا
معاً دُنیا نے میرے قہقہے پر قہقہہ مارا

مگر کھینچی جب آہِ سرد، قلبِ ناشکیبا نے
تو غم خواری کجا، مڑ کر نہ دیکھا مجھکو دُنیا نے

کہا میں نے، کہ اے وہ زلف! جو برہم نہیں ہوتی
شریکِ عیش ہوتی ہے، شریکِ غم نہیں ہوتی

یہ سُننا تھا، کہ دُنیا نے کہا، نیچی نگاہوں سے
کہ مجھ کمبخت کو فرصت نہیں خود اپنی آہوں سے

فرشتے کی سیر

اک پاک فرشتے نے آکر در کھولا ہے اک تارے کا
مشتاق تھا جو اک مدت سے اس دُنیا کے نظارے کا

پہلے تو اُسے کچھ دُھندلا سا اک داغ دکھائی دیتا ہے
پھر موجِ ہوا میں ہلکا سا اک شور سُنائی دیتا ہے

اوّل تو سیہ دھبوں کی طرح میدان نظر آتے ہیں اُسے
جب خوب نظر جم جاتی ہے انسان نظر آتے ہیں اُسے

کیا دیکھتا ہے وہ، دُنیا میں نفرت کا نشاں لہراتا ہے
انسان کا انساں دشمن ہے، ایک ایک کو کھائے جاتا ہے

"انسان" یہ کیسی ہستی ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا کہتا ہے؟
اس تارے سے بھی ناواقف جس تارے میں یہ رہتا ہے!

دنیا میں طرب کی تدبیریں کیا خوب نکالی جاتی ہیں
فولاد گلایا جاتا ہے، تلواریں ڈھالی جاتی ہیں

قوموں پہ فلاکت لانے کو شاہوں کے خزانے کھلتے ہیں
درسِ امن و اماں کا دینے کو توپوں کے دہانے کھلتے ہیں

بیگانہ ہے نسلِ انسانی کونین کی دل آویزی سے
ان خون کے پیاسے حیواں کو مطلب ہے فقط خونریزی سے

سنجیدہ ترین افراد میں بھی انداز ہیں یاں اوباشوں کے
وجد آتا ہے خونی انساں کو حلقے میں تڑپتی لاشوں کے

فاتح کو تبسم آتا ہے، جب پسپا قومیں روتی ہیں!
ایوانِ طرب کی، قبروں پر بنیادیں قائم ہوتی ہیں

معصوم فرشتہ روتا ہے تقدیر پہ ان نادانوں کی
تاریک نظر آتی ہے اسے گردوں سے جبیں انسانوں کی

عیبوں پہ فرشتے کی تھی نظر، وہ عیب سے باہر جا نہ سکا
تھی معترضانہ اس کی نظر، خوبی کا خزانہ پا نہ سکا

قانون ہے یہ اس دنیا کا جو ڈھونڈو گے وہ پاؤ گے
گر نیکی کا تصور کرتے ہو، ہر گام پہ ٹھوکر کھاؤ گے

(۲)

دیکھو وہ فرشتے نے اک تحقیق کی دل میں ٹھانی ہے
اب منظرِ عالم روشن ہے، اب صحنِ جہاں نورانی ہے

اس مرتبہ وہ کیا دیکھتا ہے، ہر ذرۂ عالم تاباں ہے
موتی کی طرح ہر آنسو میں مہتابِ تبسم غلطاں ہے

اس جنگ و جدل کے حیلے سے بے چین ہیں قومیں ملنے کو
پژمردہ دلی کے سینے میں بیتاب ہیں غنچے کھلنے کو

جتنی بھی یہ دنیا اپنی شرارت حد سے بڑھاتی جاتی ہے
اتنی ہی حدودِ نیکی سے نزدیک تر آتی جاتی ہے

سینے سے اندھیری راتوں کی چھنتی ہے ضیا انسانوں پر
فطرت کا نظامِ تعمیری ہے گرمِ عمل طوفانوں میں

ہر نقص کی بزمِ کاوش میں تکمیل کا شعلہ لرزاں ہے / ہر موجِ تباہی کے اندر جبروتِ حیاتِ انساں ہے

بادل کی گرج ہو یا نغمہ، شب ہو کہ صباحِ نورانی / ہر چیز میں ہے سرگرمِ تپش خورشیدِ عروجِ انسانی

ہر حلقہ اپنی خدمت پر مامور ہے زلفِ برہم میں / ہر ذرۂ خاکی رکھتا ہے اک خاص مقام اس عالم میں

سرگرم ہے روحِ جنگ و جدل تیغوں کے معطّل کرنے میں / مصروف ہیں سارے نقص یہاں انساں کی مکمل کرنے میں

دُھن خونِ دلِ امروز کو ہے گلکاریٔ فردا بننے کی / نیش اپنے دل میں کھولن ہے تریاق کا دریا بننے کی

رہ جائیں گے قتل و غارت کے افکار فقط افسانوں میں / تلواریں رکھی جائیں گی پُر ہول عجائب خانوں میں

مٹ جائیں گے نقشے ظلمت کے آثارِ ضیا رہ جائیں گے / قلعوں کے یہ گنبد سر بفلک آنسو کی طرح بہہ جائیں گے

خونریز فضا سے طیّارے، غاروں میں اترنے والے ہیں / پستی کے دھوئیں سے چمکیلے مینار[1] اُبھرنے والے ہیں

کہتا ہے حوادث کو جو بُرا ہمدرد نہیں ہے ظالم ہے! / در اصل وہ روحِ عالم کی، ہمت شکنی کا مجرم ہے

المختصر ان ہنگاموں کو جب خوب فرشتہ دیکھ چکا / پرواز کو بازو پھیلائے اور بامِ فلک سے دی یہ ندا

انساں کو خبر دو فطرت کے ارمان نکلنے والے ہیں،

لوہے کی جبیں سے چاندی کے فوّارے چلنے والے ہیں!

---

[1] لفظ منارہ کو بغیر ترکیب مینار کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ لفظ اُردو میں عام ہے۔ ۱۲ جوشؔ۔

اعر

تیرے اک اشارے پر مدارِ آرزو

ہرایما ترا مضرابِ سازِ زندگی

ا چاہتا ہے مجھکو زنجیروں میں تو؟

نے کیلئے مجبور کرتا ہے مجھے !

ں کی طرح دوڑوں میں دانہ کیلئے ؟

ں بات کیا مجھکو بتا سکتا ہے تو؟

ہے مجھے تونے ہی وارستہ مزاج؟

ی ہے تیری ہی زبانِ یار میں ؟

اں کو تونے ہی سکھائے ہیں فسوں؟

ڈوبی ہوئی برسات کی کالی گھٹا؟

ی تبسّم ہے شبِ مہتاب میں؟

مُسکراتا ہے دُھندلکے کا دریچہ کھول کر

یہ اگر سچ ہی، تو پھر تو کیوں ستاتا ہی مجھے
کس لئے بیکار دیوانہ بناتا ہے مجھے ؟

ہوش اس طوفان میں شاعر کو آسکتا نہیں
شعر کا وارفتہ دل یہ بوجھ اٹھا سکتا نہیں

کتنی پیچیدہ مصیبت میں پھنسایا ہی مجھے
محفلِ اضداد میں تو نے بٹھایا ہی مجھے

تابشِ توحید بھی ہے مشغلِ اصنام بھی
درسِ حکمت بھی ہی، جوشِ بادۂ گلفام بھی

جلوۂ رنگیں بھی ہی، تاکیدِ ضبطِ ہوش بھی
وعظِ ہشیاری بھی ہے، گلبانگِ نوشا نوش بھی

عشق کی آنکھیں ہیں وا، آنکھوں میں بینائی بھی ہے
حسن میں تابش ہی، تابش میں دل آرائی بھی ہی

حکم استقلال ہی ترکیبِ سیمابی کے ساتھ
سازِ بیداری ہی سامانِ گراں خوابی کے ساتھ

شورِ ادھر ہی، گامزن ہو جا عمل کی راہ میں
حُسن عریاں ہی اُدھر عشرت سرائے ماہ میں

اِس طرف یہ شورشیں ہیں، دیکھ کارِ روزگار
اُس طرف لہرا رہا ہی پرچمِ ابرِ بہار

میں ہوں تیرا پاسباں ہر چند یہ کہتا ہی تو
حُسن مجھ پر وار کرتا ہے تو چُپ رہتا ہے تو

بحر میں برپا ہے طوفاں اور سفینہ پاش پاش
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

تجھ سے پھر میں پوچھتا ہوں کیوں ستاتا ہی مجھے؟
کس لئے بیکار دیوانہ بناتا ہے مجھے؟

آبِ حیواں زہر ہی آنسو ہی پینے دے مجھے
زندگی کے راز سے واقف ہوں جینے دے مجھے

ڈالتا ہی بار کوئی شاعرِ مدہوش پر؟ — حسن کے بکھرے ہوئے ہیں بال میری دوش پر

ڈالتا ہی بار ہی مجھ پر، تو اچھا ڈال دے — پہلے ان جلووں پہ لیکن بڑھ کے پردا ڈال دے

حسن کو بیباکیاں کرنے نہ دے اس طور سے — اور اگر یہ ہو نہیں سکتا، تو سن پھر غور سے

بجلیاں جس نخل پر رقصاں ہوں، وہ پھل سکتا نہیں — تیری اس دنیا کا مجھ سے کام چل سکتا نہیں

میں پروں کو تولتا ہوں آشیانے کو سنبھال
یہ ہے دنیا، اور اپنے کارخانے کو سنبھال

سہاگن بیوہ

نیک تلسی داس گنگا کے کنارے وقتِ شام — جا رہا تھا اک طرف بشاش جپتا ہر کا نام

چرخ کی نیرنگیوں سے گفتگو کرتا ہوا — رنگِ عرفاں روح کی تصویر میں بھرتا ہوا

جھاڑیاں تھیں سبز دریا کے کنارے جابجا — پھول کملائے ہوئے تھے، سست تھی موجِ ہوا

راہ میں جالے لگے تھے، پتیوں پر گرد تھی — لانبی لانبی گھاس ہلتی تھی، پتا ور زرد تھی

جمع تھے اس طرح پتے جابجا سوکھے ہوئے — جس طرح شادی کی خیمے صبح کو اُلٹے ہوئے

جھاڑیوں سے یوں دبے پاؤں گذرتی تھی ہوا
بانسری کی دور سے جس طرح آتی ہے صدا

یوں پڑے تھے زیرِ شاخِ گل شگوفے چاک چاک
جیسے گردِ شمع وقتِ صبح پروانوں کی خاک

طائرِ درماندہ کوئی بول اٹھتا تھا اگر!
ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا کوہ و دشت پر

اور سناٹا سا وہ جس میں ہو گم آوازِ رعد
دل پہ ہوتا ہے جو طاری نالۂ پیہم کے بعد

اُس طرف رنگِ شفق تھا چرخ پر چھایا ہوا
اِس طرف دل کوہ و صحرا کا تھا مرجھایا ہوا

خار و خس پر تیلیاں ہر سو پڑی تھیں بے خبر
ابر کے دو ایک ٹکڑے تھے پریشاں چرخ پر

شام کا چہرہ غمِ پنہاں سے کچھ اُترا سا تھا
پانی تھم تھم کر جو بہتا تھا تو سناٹا سا تھا

خود بخود تاریک ساحل پر بھر آتا تھا دل
بڑھ رہی تھی تیرگی رہ رہ کے گھبراتا تھا دل

کہہ رہا تھا رنگ، غم کا ابر چھا جانے کو ہے
سانحہ کوئی قیامت خیز پیش آنے کو ہے

جاتے جاتے ایک گوشہ کی طرف پہنچی نظر
فرطِ غم سے رہ گیا شاعر کلیجہ تھام کر

دیکھتا کیا ہے کہ دریا کی روانی ہے اُداس
جل رہا ہے اک جنازہ، روشنی ہے آس پاس

کانپ کانپ اُٹھتی ہے جنگل کی سیاہی بار بار
اُٹھ رہے ہیں لاش سے شعلے، فضا ہے بیقرار

روشنی شعلوں کی اک پیشانیٔ زریں پہ ہے
ظلمتِ اندوہ بیوہ کے رخِ غمگیں پہ ہے

ہے رنڈاپا سر پہ شمشیرِ جفا تولے ہوئے
سرنگوں بیٹھی ہے رخ پر کاکلیں کھولے ہوئے

کندنی شعلے ہیں غلطاں چمپئی رخسار میں — دل دھڑکنے سی ہی جنبش سی گلو کے ہار میں

اہتمام مرگ ہیں یہ شاعری لبریز یاس — ہاتھ ہیں مہندی رچی ہی بر میں ہے چھپتی کا لباس

آہ یہ عالم کہ اب تک مست ہی موجِ نسیم — آ رہی ہی جسم سے شادی کی پھولوں کی شمیم

کہہ رہی ہے کیا بتاؤں کیا تمنا دل میں ہے — شمع یہ کس کے جنازہ کی مری محفل میں ہے

خاک سے اٹھتی ہی پھر کرتی ہے شعلوں کا طواف
کہتی ہے اے شرم کی دیوی! مجھے کرنا معاف

مڑ کے پھر میت سے کہتی ہی، اجازت دیجئے — اب تو اس ایندھن کو بھی جلنے کی رخصت دیجئے

آپ کو موت آگئی، عالم پریشاں ہو گیا — گھر ابھی بسنے نہ پایا تھا، کہ ویراں ہو گیا

یاد ہے، ہاں مجھکو شادی کا ترنم یاد ہے — ہاں، انھیں ہونٹوں پہ آیا تھا تبسم یاد ہے

آپ کے سینے سے شعلے اٹھ رہے ہیں بار بار — جل رہی ہی یہ مری اجڑی جوانی کی بہار

پوچھئے اس سے، کہ دنیا کیا تھی اور کیا ہو گئی — جس نے گھونگھٹ بھی نہ الٹا تھا کہ بیوہ ہو گئی

پھنک گئیں میری بہاریں جل گیا میرا سنگار — تیری بند آنکھیں ہیں میری زیب و زینت کا مزار

گھر سے ہمجولیاں، مل جل کے گانے آئی تھیں — مالنیں، پھولوں کا گہنا کل پہنانے آئی تھیں

آج قرباں گاہ عبرت پر چڑھانے کے لئے — موت آئی ہے مرا زیور بڑھانے کیلئے

زندگی جاؤ و رہو دنیا ہی آنکھوں میں اجاڑ — موت! جلدی کر، کہ ٹوٹا ہی رنڈاپے کا پہاڑ

کیوں کھڑی ہے دُور یوں ڈالے ہوئے تیوری پہ بل
مجھ کو بھی کھا لے، قسم ہے تجھکو او ڈائن اجل

دیکھتی ہے تو، کہ میں ہوں کس قدر جینے سے سیر
او سیہ رُو موت! خونی موت! کیوں کرتی ہے دیر؟

دیکھ میرے رُخ پہ اشکوں کی فراوانی کا سیل
اپنے جبڑوں کو ہلا، تاریک غاروں کی چڑیل!

رینگ، ناگن رینگ! مجھ بیوا کو ڈسنے کے لئے
کیا یہاں آئی ہے مُنہ اپنا جُھلسنے کے لئے

کیوں کھڑی ہے یوں الگ ٹھٹکی ہوئی سچ سچ بتا
میری باتوں نے تجھے کیا موت! برہم کر دیا

یہ اگر ہے؟ تو جھکا کر میں ترے قدموں پہ سر
مانگتی ہوں در گذر کی بھیک، مجھ پر رحم کر

اے مبارک موت، اے رازِ کمالِ زندگی
اے جہانِ خوابِ نوشیں! اے مآلِ زندگی

اے پیامِ روشنی! سرِّ بقا! تاجِ حیات!
اے نظامِ دہر! اے رفتارِ نبضِ کائنات

میری ظلمت پر بھی ڈال اپنی انوکھی روشنی
آ، اِدھر آ، شاہزادی عالمِ ارواح کی

کہہ کے یہ لپکی چِتا کے سمت وہ نازک خرام
اور کہا اے دکھ بھرے سنسار! لے میرا سلام

بس یہ سننا تھا کہ جھپٹے آگ کی جانب سے اس بھی
دیکھتے ہی آپ کو، کم سن تو کتنی گھبرا گئی

ہر طرف پہلے تو دیکھا دل میں کیا کیا ٹھان کے
اور پھر گردن جھکا لی، واس کو پہچان کے

ہو گئی فرطِ حیا سے روحِ غمگیں بیقرار
اُنگلیاں اپنی مروڑیں دیر تک، دیوانہ وار

سر جھکا، ماتھے پہ زلفِ ناز لہرانے لگی
حُسن کو آغوشِ غم میں نیند سی آنے لگی

چُپ ہوئی، تو اور دردِ ہجر دونا ہو گیا
دی صدا دل نے، ترا پہلو تو سونا ہو گیا

یہ صدا سنتے ہی دم اُلجھا، پھُریری آ گئی
اک گھٹا دل سے اُٹھی، ارض و سما پر چھا گئی

رو کے پھر کہنے لگی، بابا دعا دیجئے مجھے
زندگی کے پاپ سے جلدی چھُڑا دیجئے مجھے

آپ کی داسی پہ اب اس جگ میں رہنا بار ہے
آگ اس چھاتی میں روشن ہے، چِتا تیار ہے

جھونک بھی دیجئے مجھے اس آگ کے انبار میں
میں اکیلی ہوں، کوئی میرا نہیں سنسار میں

داس نے پھر تو قریب آ کر بہ نرمی یوں کہا
اے مری نادان بچی! سوچ تو، کہتی ہے کیا

مرنا جینا ایک ہے جن کو ذرا بھی گیان ہے
وہ اُدھر کا مرتبہ ہے، یہ اِدھر کی شان ہے

زندگی ہے نقص سے معمور، اک مہمل سی بات
موت ہے شیرازۂ قانونِ تکمیلِ حیات

قوتِ یکسو، زندگی مجموعہ اضداد ہے
"زندگی" ہے وقت کی پابند "موت" آزاد ہے

زندگی ہے روح کو محدود کر لینے کا نام
موت ہے انساں کے لامحدود ہو جانے کا نام

کہتے ہیں "فانی"، جنھیں ہم وہ فنا ہوتے نہیں
مرنے والے اصل میں ہم سے جدا ہوتے نہیں

قیدِ ہستی سے کوئی ذرّہ رہا ہوتا نہیں
ٹوٹ جاتا ہے قفس، طائر فنا ہوتا نہیں

عشق کے مالے کا اک موتی بکھر سکتا نہیں
اتحادِ باطنی مرنے سے مر سکتا نہیں

عشق کی شاخیں کسی آندھی سے جھک سکتی نہیں
رُوح کی سرگوشیاں مرنے سے رُک سکتی نہیں

زندگی بے رُوح آوازوں میں دیتی ہے پیام
موت ، سرد الفاظ کو ٹھکرا کے کرتی ہے کلام

زندگی سے تنگ سانچے میں سما جاتا ہے عشق
موت سے عالم کی پہنائی پہ چھا جاتا ہے عشق

زندگی کی موج پر گلبرگِ تر بنتا ہے عشق
موت کے گرداب میں لعل و گہر بنتا ہے عشق

بادِ طوفانی کے دیوتا پاس آسکتے نہیں
اس دیئے کو موت کے جھونکے بجھا سکتے نہیں

موت اکیا شے ہے ، کہ توڑے جبکہ خود روح الامیں
عاشقی کے رشتۂ محکم کو چھُو سکتے نہیں

جسم پر بنیادِ عشق خود نما ہوتی نہیں
روح اس تبدیلِ ہیئت سے فنا ہوتی نہیں

زندگی ، دھندلا سا اک جلوہ ہے اور کچھ بھی نہیں
موت ، اک باریک سا پردہ ہے ، اور کچھ بھی نہیں

غور کر دل میں کہ ہو جائے حقیقت بے نقاب
ٹوٹتے دیکھے تو ہوں گے بارہا تو نے حباب ؟

مر کے بھی دریا کے سینے سے کہیں جاتے نہیں
رہتے ہیں دریا ہی میں لیکن نظر آتے نہیں

یونہی تیری شمع سوزاں بھی تری محفل میں ہے
مرنے والا آنکھ سے اوجھل ہے ، لیکن دل میں ہے

جو چتا میں جل رہا ہے ، وہ تری پہلو میں ہے
کانپتے ہونٹوں میں ہے ، بہتے ہوئے آنسو میں ہے

یہ کہا شاعر نے ، اور کچھ دیر آنکھیں بند کیں
دیکھتے ہی دیکھتے بیوہ کی آنکھیں کھُل گئیں

ہنس کے پھر کہنے لگی، یا بانرا وسواس تھا　　دُور میں جسکو سمجھتی تھی، وہ میرے پاس تھا

یہ کہا اور رو فتنہ دل میں چمک پیدا ہوئی
زلف میں تابندگی، رُخ پر دمک پیدا ہوئی

صحنِ غم میں باغِ عشرت کی ہوا آنے لگی　　کان میں راحت کے نغموں کی صدا آنے لگی
زیرِ لب کہنے لگی، عالم ہے کیا تنویر کا　　دل مرا شیشہ ہے اُنکی چاندسی تصویر کا
ہے کوئی جلد آئے، شادی کا مری ساماں کرے　　بدھیاں آکر بچھائے، مانگ صندل سے بھرے
پھول برسیں جلد انگنائی کو بھرنے کیلئے　　زرفشاں طاؤس آئیں رقص کرنے کیلئے
ابر سے کہہ دو کہ میری زلف پر سایہ کرے　　جشن کی دیوی کدھر ہے، بزم میں جلوا کرے
کہہ دو مشاطہ سے آئے، لٹ کھونے کیلئے　　خم بہ خم زلفوں میں پھر موتی پرونے کیلئے
عشرتِ جاوید، باندی ہے مرے احکام کی　　اب سکھی! انبرنگیاں عاجز ہیں صبح و شام کی
سرمدی نغموں کو ہے اب ربط میرے ساز سے　　آشیاں اونچا ہے میرا وقت کی پرواز سے
حکم رقاصہ کو دو چھاگل پہنکر پاؤں میں　　آئے پچھلی رات تاروں کی سہانی چھاؤں میں

خاک تلسی کی نظر سے رشکِ گلشن ہو گئی
معرفت میں ڈوب کر بیوہ سہاگن ہو گئی!

زندگی کا قہقہہ

نوجوانی میں مصائب سے ڈرانا ہے مجھے — ناصحِ ناداں یہ ہر وہ موسمِ برق و شرر

عالمِ کیف و جنوں میں مارتی ہے قہقہے — زندگی جب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

پیرِ نرم دل

یہ مانا اتقا میں ایک بھی ثانی نہیں اس کا — مگر، خاطی جوانوں پر کبھی سختی نہیں کرتا

ابھی تک حافظے میں اسکے اتنا نقش باقی ہے — کہ میں بھی اک زمانہ میں شکارِ نوجوانی تھا

عالم اور شاعر

کل یہ اک عالم نے شاعر سے کہا، اے بے خبر
علم کی محفل میں ہستی ہے تری، نامعتبر

پیرِ مکتب سے نہیں مطلق شناسائی تری
علم کی مشعل نہیں رکھتی ہے بینائی تری

فضل تیرے واسطے اک لفظِ بے مفہوم ہے
تیری پیشانی سند کے نور سے محروم ہے

تیرے بربط میں ترانے علم و حکمت کے نہیں
سر پہ تیرے پیچ دستارِ فضیلت کے نہیں

سن کے یہ گوہر فشانی جب ہی دل کو نہ تاب
پھر تو شاعر نے دیا ہنس کر یہ عالم کو جواب

علم کے معنی حقیقت میں ہیں "دانستن" اگر
علم سے مقصد اگر یہ ہے کہ ہو گہری نظر

علم اگر یہ ہے کہ انساں پر کھلے سرِ حیات
دیکھ لے اچھی طرح پست و بلندِ کائنات

علم اگر یہ ہے کہ دل ہو رازِ فطرت سے دوچار
روحِ انسانی پہ ہو جائیں حقائق آشکار

علم اگر یہ ہے کہ انساں رازِ ہستی جان لے
دل کے آئینہ میں اپنے خال و خط پہچان لے

یہ اگر سچ ہے کہ علم اک صیقلِ ادراک ہے
پھر تو شاعر کیمیا ہے اور عالم خاک ہے

سوچ تو کچھ جی میں، اے سرحلقۂ اہلِ شعور!
کیسی بنیادوں پہ قائم ہے ترا قصرِ غرور!

نقص کے سانچے سے نکلا مردِ کامل بن گیا
اُلٹی سیدھی کچھ کتابیں رٹ کے فاضل بن گیا

مل گئی رو دھو کے اک کاغذ کے پُرزہ پر سند
اس سند کو پا کے تو اپنے کو سمجھا مُستند!

جو سند ہے، محنتِ بیہودہ کرنے کے لئے
جو سند ہے بھوک کو آسودہ کرنے کیلئے

ہوش میں آ! اے مجازی علم کے صیدِ زبوں
غور سے سُن، علم کے بارے میں جو کچھ میں کہوں

علم اصلی اور ہے، علمِ کتابی اور ہے
پردہ داری اور شانِ باریابی اور ہے

ہاں، یہ مانا، کچھ کتابوں میں بھی ہیں جوہر ضرور
لیکن اس حد پر نہیں جن پر کرے کوئی غرور

یہ کتابیں کیا ہیں؟ کچھ علمی خزانوں کے نشاں
جس طرح جغرافیہ میں بحر و بر کی داستاں

ماہرِ جغرافیہ کتنا ہی کھائے پیچ و تاب
مل نہیں سکتا اُسے سیّاحِ عالم کا خطاب

صرف نقشے کی مدد سے اے گرفتارِ مجاز
کوئی دریا کی اُمنگوں کا سمجھ سکتا ہے راز؟

آہ، تو نقطوں کو نادانی سے کہتا ہے "نجوم"
روشنائی کی لکیروں کو سمجھتا ہے "علوم"

کاغذی گھوڑوں کو دوڑا کر بنا ہے شہسوار
کچھ خبر اسکی بھی ہے اے عالمِ بے اعتبار؟

ملتے ہیں اُس دور میں بھی علم کے نقشِ قدم
تھی ضمیرِ حق میں جب ایجادِ قرطاس و قلم

سامعہ تھا جب صریرِ کلک سے نا آشنا
سوچنے والے دماغوں میں تھا مخزن علم کا

کس لئے حیران فکرِ دعوئے باطل میں ہے
علم کا چشمہ کتابوں میں نہیں ہے، دل میں ہے

آسماں پر طائرِ سدرہ ہے میرا ہم صفیر
دیکھ ادھر اے مضحکہ خیز اصطلاحوں کے اسیر

شاعر، اُس علمی شعاعِ نور سے ہے بہرہ یاب
جس کو شہرِ علم کا بخشا تھا آقا نے خطاب

"شاعری جزویست از پیغمبری" آگاہ ہو
"جاہلانش کفر خوانند از خری" آگاہ ہو

ہو، اگر ہے زندگی میں مجھ سی تجھکو سوءِ ظن
"شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن"

"بر فلک تابد مسیحا رشتۂ زنارِ ما"
"بر زمیں منصور افراز دستونِ دارِ ما"

تیرے گرد و پیش ہی لے دے کے مکتب کا نصاب
اور شاعر کا کتب خانہ ہے طلوعِ آفتاب

گامزن ہے فکر تیری مدرسے کی راہ میں
اور سبق لیتا ہوں میں آغوشِ مہر و ماہ میں

تیری تابانی پہ بیچتوں کے احساں کا ہے داغ
میں خود اپنے خون سے دل کا جلاتا ہوں چراغ

منتِ اُستاد سے آئینہ تیرا چُور چُور
آشیانہ ہے مرا پروازِ انسانی سے دُور

مجھ کو تہ کا شوق، تو حیران ساحل کیلئے
تو ہے معدے کیلئے بیتاب، میں دل کیلئے

لوٹنا پڑتا ہے تجھکو میکدی کی خاک پر
میرا نشتر ہے براہِ راست نبضِ تاک پر

دائری حرفوں کے تیرے واسطے بحرِ علوم
اور یہاں پہنائے گردوں پر چمکتے ہیں نجوم

تیرا لطفِ زندگی، اوراق گردانی میں ہے
اور یہاں روح الامیں کی بال جنبانی میں ہے

کھا چکا ہی تیرے ہم چشموں کو طوفانِ ممات
میرے ہم پیشہ ہیں ابتک لطف اندوزِ حیات

تیرا گوشِ عقل ہی گہوارۂ صوتِ خطیب
اور یہاں فطرت کے لب رہتے ہیں کانوں سے قریب

تیرے ثانی لاکھ مل سکتے ہیں لاثانی ہوں میں
تو ہے تلمیذِ بشر، تلمیذِ رحمانی ہوں میں

عکسِ رخسارِ "ادب" در دل نہاں داریم ما
در دلِ دوزخ، بہشتِ جاوداں داریم ما
چیست خاکِ تیرہ، تا باشد تماشا گاہِ ما
سیرہا در خویشتن، چوں آسماں داریم ما
(صائب)

پُر اسرار صدا

روز و شب آتی ہے ان کانوں میں اک شیریں صدا
کون اس پردہ میں ہی، کھلتا نہیں یہ ماجرا

رکھتی ہے حلقے میں مجھکو ایک موجِ سوز و ساز
کرتی ہے میرا تعاقب اک صدائے دل نواز

ہر نفس اک درد اُٹھتا ہے نئے انداز کا
دل پہ گو کھلتا نہیں مفہوم اِس آواز کا

ہر صدا سینے پہ میرے بارِ غم رکھتی ہوئی
کانپتی آتی ہے اشکوں پر قدم رکھتی ہوئی

یہ صدا، جیسے ہو کوئی روح گھبرائی ہوئی
روز و شب رہتی ہے میرے قلب پر چھائی ہوئی

اور بالتخصیص، جب تاروں کی ہلکی چھاؤں میں رقص کرتی ہے صبا، چھاگل پہن کر پاؤں میں

دیکھتی ہے ایک پرچھائیں سی حیرانی مری
اور کسی کی سانس چھو لیتی ہے پیشانی مری

دیدہ وری

ہم نشیں! مشکل سے آئے گا تجھے اس کا یقیں
دیکھتی ہے ہر نفس کیا کیا نگاہِ دُور بیں

اک سکوں سا، زلزلوں کے قلب میں مانندِ راز
خامشی میں ایک مبہم سا سرودِ جاں نواز

تلخیوں میں شہد کی بے رنگ سی اک نرم موج
پستیوں کے سایہ میں دھندلی سی اک تخئیلِ اوج

دیدۂ بے نور میں اک بھولی بھٹکی سی نگاہ
شب کی تاریکی میں اک کھویا ہوا سا عکسِ ماہ

شیب میں اک بے نشاں سی زرد تنویرِ شباب
بیوگی میں ایک بے جاں سی عروسی آب و تاب

سینۂ آہن میں اک نادیدہ سی دلکش لچک
خار و خس میں نبضِ گل کی اک ملائم سی دھمک

ظلمتوں کے دائرے میں ایک ہلکی سی کرن
جھاڑیوں کی شب میں اک موہوم سا خوابِ چمن

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند
تا بجرمِ گوششِ نہہد خلق، خوارم کردہ اند
(غالب)

شکستِ غم

رُخ پہ ڈالے ہوئے سیاہ نقاب — غم نے آکر کیا یہ مجھ سے خطاب
مجھ کو بھیجا ہے لالہ زاروں نے — تیری گذری ہوئی بہاروں نے
شمعیں ماضی کی خواب گاہوں کی — تجھ سے طالب ہیں سرد آہوں کی
خوابِ بیتیں نے تیری دی ہے یہ رائے — اب نہ تیری پلک جھپکنے پائے

اُس تبسم نے، تھا جو وجہِ نمو
تجھ سے مانگے ہیں خون کے آنسو

جوش! سن کر یہ داستانِ ستم — میں یہ کہتا ہوا بڑھا سوئے غم
اہلِ دل، حُزن سے کسے چاہیں؟ — آ، کہ گردن میں ڈال دوں باہیں

جب ملا غم کو یہ لطیف جواب
مسکرانے لگا اُلٹ کے نقاب

پیمبرانہ بددعا

جو بن پڑے گا، تو سب سے بڑی سزا دوں گا
زمانہ ساز! تجھے میں یہ بدُعا دوں گا

ملے نہ آتشِ دوزخ کی تجھکو نرم سزا
ملے وہ سوز جو ہوتا ہے شاعروں کو عطا

رموزِ دہر سے بڑھ جائے رسم و راہ تری
جبینِ زیست پہ پڑنے لگے نگاہ تری

تجھے حقائقِ ہستی کا کھولنا آجائے
کلی کو خار کے کانٹے پہ تولنا آجائے

عدو پہ بھی تری فطرت شفیق ہو جائے
ترے ضمیر کا لوہا رقیق ہو جائے

دماغ، سرحدِ قدرت سے متصل ہو جائے
ہر ایک ذرّہ ناچیز، جزوِ دل ہو جائے

وہ طبعِ سخت میں پیدا ہو انقلابِ عظیم
کہ تیرے قلب میں چبھنے لگی گلوں کی شمیم

ترے دیار میں طوفانِ آرزو آجائے
ترا ضمیر، محبت کے روبرو آجائے

نہ بہرہ ور ہو کبھی مرگِ ناگہانی سے
خدا دوچار کرے طولِ زندگانی سے

درِ حیات، تری چشمِ دل پہ وا ہو جائے
نظر مآلِ تبسم سے آشنا ہو جائے

بلائے قہرِ خدا تجھ کو دیدہ ور کر دے
لطیف کر کے حسوں کو لطیف تر کر دے

ناقابلِ فہم

حیراں ہوں، آجکل ہے یہ کیا زندگی کا طور؟
ہر وقت اک سکوت ہے، ہر آن ایک غور

اک آن میں امیر ہوں، اک آن میں غریب
خود سے ہوں فاصلے پہ کبھی اور کبھی قریب

ہر لمحہ ایک فکر ہے، ہر آن اک کُرید
اور کیوں ہے کس بنا پہ ہے؟ کھلتا نہیں یہ بھید

پھیکا سا اک لبوں پہ تبسم بجھا سا دل
ہر دم خود اپنی ذات سے اک گونہ منفعل

چھائی ہوئی ہے ابر کی صورت دماغ پر
سنجیدگی، رموزِ ابد سے عمیق تر

سینے میں چبھ رہی ہے مرے ایک موجِ نور
دل سے قریب، فہم سے بالا، نظر سے دُور

موجِ سحر سے ظلمتِ شب کو تراش کر
کرتا ہے کوئی روز اشارے، کہ آ اِدھر

کچھ اجنبی زبان میں کرتی ہے گفتگو
راتوں کو اک بعید سی موہوم آرزو

رہتا ہے گرد و پیش اک ایسا جہانِ خواب
جس کا غروب ہی نہیں ہوتا ہے آفتاب

ساکن ہوں اور خیال ہے آوارہ کُو بہ کُو
کس چیز کی تلاش ہے؟ کس شے کی جستجو؟

خود اپنے ولولوں کو بھی پہچانتا نہیں
کس راستے کے موڑ پہ ہوں، جانتا نہیں!

گلابی نور

بُعد چاہے معنوی ہو، خواہ صوری، ہم نشیں
فیض سے اپنے بنا دیتا ہے ہر شے کو حسیں

بخشتی ہے اس لئے بازیگری دل کو سرور
فہم کی آنکھوں سے اس کا سلسلہ ہوتا ہی دُور

جانتے ہو، کیوں ہی یوں وجدان پر چھایا ہوا
فاصلے پر ہی حدودِ عقل و دانش سے خدا

یہ چراگاہیں، یہ حیواں، یہ چمن، یہ بوستاں
پاس سے ان میں نظر آتی ہیں کیا کیا خامیاں

دُور سے دیکھو، تو خوش آتی ہی ادنیٰ سی ببول
خار ہیرے کے نظر آتے ہیں اور کندن کے پھول

کیف کی بھی ہے یہی حالت کہ جاں پرور شراب
ڈال دیتی ہے رُخِ اشیا پہ ہلکی سی نقاب

سُرخ ہو جاتی ہیں جب آنکھیں گلابی نور سے
دیکھنے لگتا ہے اس دُنیا کو انساں دُور سے!

حیوان

مجرموں کو اسفدر شدّت سی کہتا ہی شریر
یہ عنایت کا محل ہی، رحم کر، اے خوردہ گیر

میں نے یہ مانا، کہ انساں میں ہی وہ روحِ عظیم
جس کے آئینے میں ہی تصویرِ یعقوب و کلیم

ہاں، یہ سچ ہے، آدمی ہی وہ وجودِ سرفراز
خود دلِ صنّاعِ جن وانس کو ہی جس پہ ناز

یاد رکھ، لیکن، یہ نکتہ بھی، اگر انسان ہی
کچھ ہو، انساں، اک ترقی یافتہ حیوان ہی

لذّتِ گریہ

ایک لذّت، لطیف، ہلکی سی
جیسے بُو، ناشگفتہ کلیوں کی

جاں فزا، حرفِ دل نشیں جیسے
طفل کا خوابِ شکریں جیسے

جیسے ہلکے سے ابر میں خورشید
خواب میں جیسے روئے یار کی دید

بن میں جس طرح جھومتی برسات موسمِ گل کی جیسے پچھلی رات
جیسے کوئل کی دُور سے کُو کُو! مست، جیسے عروس کی خوشبو
دل میں جس طرح مے کشی کی ترنگ دھوپ میں بوندیوں کا جیسے رنگ
نرم، لعلِ شکر فشاں کی طرح دل نشیں، مرگِ ناگہاں کی طرح
الغرض، وہ فسوں اثر لذّت جس میں غلطاں ہے گوہرِ عشرت

رات جس وقت بھیگ جاتی ہے
میرے اشکوں میں مسکراتی ہے

خلفشار

اک صدا سینے سی مجھ کو آرہی ہے بار بار ہو نہ ہو، کوئی مدد کیو اسطے ہے بیقرار
ہے کچھ ایسی کشمکش، اس کاہشِ امداد میں صید جیسے پھڑپھڑائے پنجۂ صیّاد میں
تیرگی وہ ہے، چراغِ جستجو جلتا نہیں دیکھتا ہوں ہر طرف لیکن پتا چلتا نہیں

حملہ آور عشق پر عقلِ فرومایہ نہ ہو
دل پہ دُنیائے دنی کا یہ کہیں سایہ نہ ہو

موتی یا شبنم

اک دور وہ آنیوالا ہے، دُنیا کی خوشی مٹ جائیگی
چلنے میں قدم تھرّائیں گے، اُٹھنے سے نظر شرمائیگی

آئینہ فروغِ طلعت کا چھٹ جائیگا دستِ زینت سے
قندیلِ حیاتِ فانی کی، ہر سانس میں لو تھرّائیگی

اس نازِ تکبرِ فطرت کا پندارِ خودی مٹ جائے گا
اس حسنِ کشیدہ قامت کی بل کھا کے کمر جھک جائیگی

بدمست جوانی کی آنکھیں جس چیز کو "موتی" کہتی ہیں
دیکھے گی جو پیری جھک کے اُسے، اک قطرۂ شبنم پائے گی

جوانی کا بسترِ مرگ

سبق عبرت کا ہے نادان بالوں کی سفیدی سے
کفن اوڑھا ہے جیتے جی نگارِ زندگانی نے

نظر کر جھریوں سے شیب کے سمٹے ہوئے رُخ پر
یہ وہ بستر ہے، دم توڑا ہے جس پر نوجوانی نے

ظلمتیں

تیرگی لپٹی ہوئی ہی دہر میں ، ہر ضو کے ساتھ
عربدہ کرتا ہی یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ

لعلِ شیریں کے تبسّم میں ہی غلطاں آہِ سرد
ظلمتوں کی رَو بھی ہی قندیلِ رُخ کی لَو کے ساتھ

ہم نفس! بایں ہمہ برنائی و افسوں گری
بیوگی کا دبدبہ بھی ہی عروسِ نَو کے ساتھ

اس قدر بھی ناز فرماتا ہی کوئی اے چمن
دھوپ بھی ہی ابرِ زنگارنگ کے پرتو کے ساتھ

حُسنِ شیریں و غرورِ تاج کے ہوتے ہوئے
تیشۂ فرہاد کا دھڑکا بھی ہے خسرو کے ساتھ

انجمن میں رات کو چپکے سی پایا جاتا ہے بار
فتنۂ ظلمت نشاں بھی روشنی کی رَو کے ساتھ

ڈوب جاتا ہی تڑپ کر سینۂ دریا میں جوش
سوزِ پیچ و تاب بھی تنویرِ ماہِ نَو کے ساتھ

روشنیاں

صرف ظلمت ہی نہیں ہے، دیکھ تنویریں بھی ہیں
کاوشِ تخریب کی ہلچل میں تعمیریں بھی ہیں

جس جگہ خورشید کی حدت سے ہے عالم خموش
واں کسی دیوار کے سایہ میں تقریریں بھی ہیں

جس جگہ مایوسیاں ہیں گردشِ تقدیر سے
واں کہیں امید کی پوشیدہ تدبیریں بھی ہیں

جس جگہ ژولیدہ عقدوں سے ہیں عقلیں سرنگوں
واں حیات و مرگ کی تابندہ تفسیریں بھی ہیں

جس جگہ منڈلا رہے ہیں مبہم و تاریک خواب
واں کسی گوشہ میں ان خوابوں کی تعبیریں بھی ہیں

جس جگہ تعزیر کرشایاں ہے ذوقِ نقش و رنگ
واں کہیں آئینوں میں رنگین تصویریں بھی ہیں

جس جگہ پانی میں ہے زہرِ ہلاہل کا اثر
واں ہوا میں چشمۂ حیواں کی تاثیریں بھی ہیں

جس جگہ دوڑی ہوئی ہیں سنگ خارا کی رگیں
واں درخشاں جوہروں کی نم تحریریں بھی ہیں

ٹوٹتا ہے سلسلہ کب زلفِ عنبر بیز کا
میں نے مانا طوق بھی ہے، جوشؔ، زنجیریں بھی ہیں

اضطراب

نظر آئی اک قبر کل رات مجھکو گذرتے ہوئے راستے کے کنارے
مچلنے لگے میری آنکھوں میں آنسو جھپکنے لگے آسمان پر ستارے

موت کا پھریرا

جن ذہین و ماہِ رُخ بچوں کی تقدیر و کمیں ہوش غنچگی کے عہد ہی میں لکھی ہوتی ہے قضا
پیشتر ہی سے پھریرا موت کا با صد جلال اُن کی آنکھوں میں نظر آتا ہے لہراتا ہوا!

انگاروں کی دہک

ہم نشیں! آیا ہوں دردِ دل سنانے کیلئے
آج آمادہ ہوں سوتوں کو جگانے کیلئے

توڑ ڈالی تھی سواری ہمرہانِ خام نے
اور تیرہ میل کا پیدل سفر تھا سامنے

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور تھا پچھلا پہر
موجزن سیّال چاندی تھی بساطِ خاک پر

بولنے والی تھیں کلیاں ہنسنے والے تھے گلاب
جھلملاتے تھے ستارے جھک چلا تھا ماہتاب

جاگنے والی تھی دنیا پھر نئے انداز سے
سونے والے چونکتے ہی پر تھے خوابِ ناز سے

دور تک تابندہ میداں تھا، کہ بحرِ ضو فشاں
حاشیے پر تھیں پہاڑوں کی روپہلی چوٹیاں

راہ تھی افسانۂ ماضی کو دہراتی ہوئی
مقبروں کے درمیاں سے پیچ و خم کھاتی ہوئی

تھی، تو کہنے کو خموشی عالمِ ذرّات میں
لیکن ایسی، جیسے رن لوٹے اندھیری رات میں

یہ سماں، اور آ رہا تھا میں عجب انداز سے
ایک متوالی جوانی کی حریمِ ناز سے

تھا لبوں پر لعلِ شیریں کی حلاوت کا اثر
لرزشِ مستانہ کا طوفان تھا ہر گام پر

حسن کے فیضِ تبسّم سے نظر کے سامنے
موتیوں کے سے فضا میں بن رہے تھے دائرے

ہو رہا تھا قربتِ جاناں کا دھوکا بار بار
آ رہی تھی متصل شانوں سے بوئے زلفِ یار

فرق پر تھا ماہتاب، اور روح پر عکسِ حبیب، آ گیا میں جھومتا، القصہ، دریا کے قریب

دیکھتا کیا ہوں، کہ ہلکی چاندنی ہے پاش پاش
جل رہی ہے ساحلِ "موسیٰ ندی[1]" پر ایک لاش

چاندنی ہے اپنی برنائی پہ شرمائی ہوئی آسمانوں پر ہے اک سنجیدگی چھائی ہوئی
تھرتھرئی ساحل، سنہری آگ، ہلکا سا دھواں کپکپاتی سی زمیں، پگھلا ہوا سا آسماں
دُور تک چھایا ہوا امیداں پہ ابرِ سوز و ساز چاندنی میں آنچ کی سُرخی ہوا ؤں میں گداز
خار و خس پر جابجا کچھ خون کی سی دھاریاں سُرخ انگاروں کی چادر، پُرفشاں چنگاریاں
سُرخ انگاروں میں غلطاں، سر برہنہ آرزو بھیس میں چنگاریوں کے لعلِ آتش لہو

کرّوفر، پندارِ زر، ذوقِ ادا، کچھ بھی نہیں
آنچ کی غمناک جنبش کے سوا کچھ بھی نہیں

دُور تک گونجی ہوئی ہے یہ صدائے دردناک "آدمی" بن کر نہ اترا اس قدر اے "تیرہ خاک"
دُور ہیں اب، زندگانی وقف تھی جن کیلئے عمر نے راتیں جگائی تھیں اسی دن کیلئے
آج خاکستر ہے کہتے تھے جسے کل تک "حیات" "زندگی"! کیا تھی تری لے دے کے اتنی کائنات؟
آہ! اے موجِ نفس پر کانپنے والے حباب! منحصر ہے چند سانسوں پر ترا شیب و شباب
موت کے کانٹے پہ تیری حسرتیں تُلتی نہیں اِن مناظر سے بھی کیا آنکھیں تری کُھلتی نہیں

تا سزا اوہام کو، نادان! ٹھکراتا نہیں!
خاک کے ناچیز پُتلے ہوش میں آتا نہیں!

---

[1] حیدرآباد دکن کی ایک ندی ۱۲

مرگ و موسیقی

دھوپ میں اک گدائے راہ نشیں | کچھ سہ پاکا جس کو ہوش نہیں
نہ تو بشّاش ہی ہے اور نہ ملول | دیر سے ہے سرود میں مشغول
نغمہ آوازہ ہے غبار کے ساتھ | دف کی آواز ہے ستار کے ساتھ
زلزلے ہیں دلوں کی جنبش سے | نیم حلقے ہیں سُننے والوں کے
نغمہ ہے اس طرف، اُدھر ہے سکوت | دُور سے آرہا ہے اک تابُوت
اِس طرف لحنِ زندگی کی صدا | اُس طرف موت کا ہے سناٹا

اے تخیُّل یہ طُرفگی کیسی؟
ایک مرکز پہ مرگ و موسیقی!

امیرِ متکبّر سے

شاعرانِ خستہ سے ملتی نہیں تیری نگاہ
اللہ اللہ یہ تکبّر، اے امیرِ خود پسند!

خاکساروں کی طرف سے جب گذرتا ہے کبھی
یوں اکڑ جاتا ہے گویا کھینچ رہا ہے بند بند

یہ اکڑ ہے درحقیقت کھوکھلے پن کی دلیل
نرم کر گردن کے خم کو، کھینچ لے پاکِ سمند

کھول دے پیشانیٔ دولت فروشی سے گرہ
پھینک دے دوشِ امارت سے تبختر کی کمند

بارگاہ و حاجب و خدّام و دینار و درم
ہاں یہ مانا، تو ہے ان سب نعمتوں سے بہرہ مند

ہاں سمجھتا ہوں کہ تیرا طرّۂ طرفِ کلاہ!
آسماں کیا؟ بلکہ ہے عقدِ ثریّا سے بلند

پھر بھی ہے عمگیں خاک کے پامال ذرّوں کی طرف
اس حقارت سے نہ دیکھ اے آفتابِ ارجمند

"در سفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید
کیں حریفاں خدمتِ جامِ جہاں بیں کردہ اند" (حافظ)

بیکاری

محوِ بازیگری ہے راہ میں نٹ — رہرووں کے لگے ہیں ٹھٹ کے ٹھٹ
ہند میں، اے ہجومِ حیرانی — کتنی ہے وقت کی فراوانی

خامی

اک گداگر راہ میں ہے نغمہ فروش — گرد بیٹھے ہوئے ہیں سب مے نوش
کیوں جھجکتا ہے لطف اٹھانے سے — غول میں مل کے بیٹھ جانے سے

بستۂ زلفِ ننگ و نام ہے تو
جوشؔ! ابھی شاعری میں خام ہے تو!

دُعا

اے ضعیفہ! یہ ماجرا کیا ہے
سچ بتا، یہ تجھے ہوا کیا ہے ؟

سیکڑوں تربتیں ہیں پیشِ نظر
خود بھی بیٹھی ہے ایک تربت پر

پھر بھی دیتی ہے رہروؤں کو صدا
تم سوا سو برس جیو بابا!

عید ملنے والے

کہوں کیا دل پہ کیا کیا ہولناک آلام سہتا ہوں
نہ پوچھ اے ہمنشیں! کیوں عید کے دن سُست رہتا ہوں

وہ صدمے جو لگے رہتے ہیں آسائش کی گھاتوں میں
وہ دُنیا سسکیاں بھرتی ہے جو تاریک راتوں میں

وہ چشمہ غم کا سینے سے زمیں کے جو اُبلتا ہے
وہ غمگیں کروٹیں جو آسماں شب بھر بدلتا ہے

وہ جھوٹی راحتیں جن سے نہاں ہیں درد کے پہلو
وہ پھیکے قہقہے گرتے ہیں جن سے خون کے آنسو

وہ کوندے غم کے، روحوں کے اُفق پر جو لپکتے ہیں
وہ دل جو سینۂ ذرات میں پیہم دھڑکتے ہیں

وہ جھونکے نرم جن میں رات بھر دم ہی نہیں لیتی
غریب انسانیت کی سُست رَو غمناک موسیقی
وہ دل مشغول ہیں جو زندگی کے دردِ پیہم میں
وہ آنسو، جو ہیں غلطاں دیرِ خ اشیائے عالم میں

صباحِ عید کے جس وقت جلوے مُسکراتے ہیں
یہ سب روتے ہوئے مجھ سے گلے ملنے کو آتے ہیں

غمگین صدا

شام کا وقت، مقبرے کی ہوا
غم میں ڈوبا ہوا ہر اک ذرّا
دل میں بیدار عاقبت بینی
جُھٹ پُٹے کی اُداس رنگینی
وسط میں مقبرے کے اک میدان
اور میداں میں کھیل کے سامان
قاعدے سے تنا ہوا اک جال
غرق ٹینس کے شوق میں اطفال
آ رہی ہے یہ تُربتوں سے صدا
بچّو! راس آئے تم کو خوش رہنا

چرخِ ہستی پہ تھے ستارے سے
ہم بھی تھے ایک دن تمھارے سے!

مقدّس رات

ظلمتِ شب آج ہے وہ دل نواز
رُوح ہے نورِ سحر سے بے نیاز

دل کے روشن ہو رہے ہیں سب نقوش
تیرگی ہے آج کی آئینہ ساز

حاملِ صد نغمۂ اسرار ہے
آج کی شب کا سکوتِ دل گداز

دل سی شئے سے باوجودِ اتّصال
ہو رہا ہے دُور سے رازِ نیاز

اس طرح ظلمت میں بیٹھا ہوں خموش
جس طرح آسودہ ہو سینے میں راز

اذان

اُفق سے سحر مُسکرانے لگی!
مؤذن کی آواز آنے لگی

یہ آواز ہرچند فرسودہ ہے
جہاں سوز صدیوں سے آلودہ ہے

مگر اس کی ہر سانس میں متّصل
دھڑکتا ہے اب تک محمدؐ کا دل

کش مکش

عقل حیراں ہے، ہو تو کیونکر ہو؟ شرحِ اسرار، بن نہیں پڑتا
جانتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور پھر بھی اظہار، بن نہیں پڑتا

دل کو اقرار میں تامل ہے
اور انکار بن نہیں پڑتا

پامالی

آج ہنگامِ سیر، اے ہمدم! آ گیا ایک پھول زیرِ قدم،
پھول! اور موت کے اٹھائے ناز "دو کچھ" سے اک آئی دردناک آواز

ہائے کیا عمر تھی یہ پامالی
جس نے اک زندگی کچل ڈالی

خونی بینڈ

روح بے چین ہے، خاموش ہو اے فوج کے بینڈ
اس طرح صبح کی مخمور ہواؤں میں نہ اینڈ

تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی !
سنسناہٹ ہے لچکتی ہوئی شمشیروں کی

کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں
کتنے مہپارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں

کتنی روندی ہوئی لاشوں کی ہے سردی تجھ میں
کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں

کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں
کتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں

تیرا ہر راگ ہے ڈوبا ہوا چشم نم میں !
رقص خونی کی دھمک ہے ترے زیر و بم میں

سسکیاں تجھ میں ہیں غلطیدہ دل افگاروں کی
کروٹیں موت کی ہیں گت میں ترے تاروں کی

تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو
تیری آواز میں غلطاں ہے جوانوں کا لہو

گم ہیں رستے ہوئے زخموں کی بہاریں تجھ میں
خنجروں کی ہیں مچلتی ہوئی دھاریں تجھ میں

نغمہ ہے لے میں تری، خون کے فوّاروں کا
زمزمہ تجھ میں ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

تیری آواز جب احساس پہ چھا جاتی ہے
موت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

اب تک

بے تعارف بھی کہن سال مسلمان اب تک
آتے ہی روبرو میرے، مجھے کرتے ہیں سلام
سخت حیراں ہوں کہ اس مشق گنہ کے باوصف
ثبت ابھی تک ہے مری شکل پہ مُہرِ اسلام!

بادشاہ کا جنازہ

کھڑے ہوئے ہیں کمربستہ حاجب و درباں
نکل رہا ہے حرم سے جنازۂ سلطاں
دبا ہوا ہے کفن سے جلالِ سُلطانی
جُھکا ہوا ہے سرِ نازشِ جہانبانی
بچھا ہوا ہے پئے خاک، خاک کا بستر
نظر جھکائے ہوئے ہے، غرورِ تاج و کمر
وہ حلق، جس کی گرج میں تھا شورِ بادِ سموم
نفس کی آمد و شد سے بھی آج ہے محروم
اُڑا ہوا ہے رخِ شانِ خسروانہ کا رنگ
قضا کے سایہ میں ہے نازِ افسر و اورنگ
دریچہ بند ہے دولت پہ عیش و عشرت کا
مقامِ عجز میں ہے طنطنہ حکومت کا

اِدھر ہیں اہلِ قلم غم سے سر جھکائے ہوئے
اُدھر کھڑے ہیں سپاہی پَرے جمائے ہوئے

بتاؤ ہے کوئی ایسا سپاہیوں میں جواں؟
چھڑا لے موت کی چٹکی سے دامنِ سلطاں

قضا چلی ہے لئے شہ کو سوئے گوشۂ تار
بڑھے، کدھر ہے شہنشاہ کا سپہ سالار؟

کہو طبیب سے سوتے ہوئے کو چونکا دے
عروقِ مُردۂ سلطاں میں خون دوڑا دے

صدا دو کوئی خزانے کے ساز و ساماں کو
دفینہ دفن نہ ہونے دے اپنے سلطاں کو

صبا حِ تاج پہ چھائی ہوئی ہے ظلمتِ شام
چمک رہا ہے مگر وجہِ ربِّ ذوالاکرام
خجل ہے خاک کے پتلے کا رعبِ عزت و جاہ
زبانِ دہر پہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!

جفائے دوست

شکوہ ہے خنجرِ اغیار کی عریانی کا
اور ابھی دوست نے رخ سے نہیں الٹی ہے نقاب

حدّتِ مہر سے فریاد ہے میرے لب پر
ہائے وہ وقت، کہ جب عشوہ کریگا مہتاب!

انکشافِ فطرت

آدمی بزم میں دمِ گفتار | لب پہ جب کوئی حرف لاتا ہے
در حقیقت خود اپنے ہی حق میں | کچھ نہ کچھ فیصلہ سناتا ہے

ضبطِ گریہ

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر | سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو، کہ دل ہو آئینہ | ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر

راہِ تلاش

اگر نجوم ، بناتا ہیں ، تجھ کو دل کے داغ
نہ ڈھونڈھ ظلمتِ ہول آفرینِ شب سے فراغ

سمندِ صرصرِ باطل کو تیز تر کر دے !
یقینِ حق کا اگر جھلملا رہا ہے چراغ

شراب خانۂ ذوقِ جنوں میں داخل ہو
چھلک رہا ہے اگر زہر سے خرد کا ایاغ

جلالِ صاعقہ پرور سے اُنس پیدا کر
اگر جمال کا ملتا نہیں ہے تجھکو سُراغ

اگر اُچاٹ ہے گلبانگِ عندلیب سے دل
تو بن خدا کیلئے محرمِ ترانۂ زاغ

بتوں کی کاکلِ پیچاں میں دل کو اُلجھا دے
اگر خدا سے بغاوت پہ مضطرب ہے دماغ!

آبگینہ

ہم حباب آسا ہیں ، لازم ہے کہ جب ہم سے ملو
دوستو! باریک بینی سے خدارا کام لو

ظنِ غالب ہو ، اہانت کا کہ ذلت کا یقیں
اہلِ دُنیا کے دلوں کو توڑ دے ممکن نہیں

مشتبہ سا اک تبختر ، ایک مبہم سا غرور
شیشۂ شاعر کو کر دیتا ہے لیکن ، چُور چُور

چراغِ عظمت

تھا سکوں جب کارفرما عالمِ اسباب میں
میں نے دیکھا ہمنشیں! پچھلے پہر یہ خواب میں

رہگذر میں بادِ صرصر کی بصد شانِ فراغ
جل رہا ہے طاقِ زریں، ایک ہیرے کا چراغ

خندہ زن ہے صبح پر جس کی درخشانی سے رات
نور سے جس کے فروزاں ہے جبینِ کائنات

تُند و بے پروا ہوائیں جس کو پا سکتی نہیں
چل رہی ہیں آندھیاں لیکن بجھا سکتی نہیں

دل میں یہ آیا مری محفل میں جل سکتا یہ کاش
پاس جاتا تھا، کہ اک آواز آئی "دور باش"

ہے یہ تیرا ہی چراغ، اے شاعرِ رنگیں صفات
لیکن، اس سے فیض اٹھا سکتی نہیں تیری حیات

اس کو پا سکتا نہیں تو بزمِ عشرت کے لئے
یہ تو ہے نادان! تیری لوحِ تربت کے لئے

ہو گی تیری تیرہ قسمت زندگی جب خواب میں
جگمگائے گا یہ تیری موت کی محراب میں

یاد کرنا

جس وقت شباب پر ہو ساون
فردوس بریں ہو صحنِ گلشن

پھولوں سے بھرا ہوا ہو دامن
دشوار ہو فرقِ دوست و دشمن

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا !

جب یادِ گذشتہ انجمن ہو
ماتھے پہ ملال کی شکن ہو

سینے میں کشاکشِ محن ہو
غربت میں تصورِ وطن ہو

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا !

جب پارۂ سنگ یوں اچھالیں
دھوکے میں گُہر کو لوگ اٹھالیں

جب بے ہنروں کی سخت چالیں
اربابِ ہنر کو روند ڈالیں

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا !

جاڑوں میں جب آگ کے کنارے
راتوں کو ہوں جمع دوست سارے

آنکھوں میں ہوں کیف کے شرارے
گردوں پہ چمک رہے ہوں تارے

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا !

جب عزقِ خودی ہو شہریاری — دربار پہ ہیبتیں ہوں طاری
غیرت ہو شکارِ بے قراری — زخمی ہو غرورِ خاکساری

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا!

ساحل پہ ہو جب ہوائے سنبل — ہو رامش و رنگ و بادۂ و گل
ساقی کی نظر میں ہو تجمّل — سینے پہ مچل رہی ہو کاکل

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا!

جب رات کی تیرگی ستائے — اور نبضِ حیات چھوٹ جائے
جب نیند کسی طرح نہ آئے — اور صبح افق سے مُسکرائے

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا!

جب روح کو عشق یوں جگائے — دل بغض و عناد بھول جائے
باطن پہ وہ رنگِ دوست چھائے — دشمن کی ادا پہ پیار آئے

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا!

ہوشیار

خانقاہوں سے سجادہ نشیں، کہاں بہرِ شکار
بیٹھے ہیں دیکھے کہیں گا ہو نہیں نقلی دیندار

ہوشیار!

اے مردِ مومن ہوشیار!

زیرِ کف ہیں سادہ لوحی سے مریدانِ حقیر
ہات پھیلائے ہوئے ہیں صوفیانِ ذی وقار

ہوشیار!

اے مردِ مومن ہوشیار!

دل کی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہوں ان آنکھوں کے ساتھ
آہ ایسے اب کہاں ہیں عابدِ شب زندہ دار!

ہوشیار!

اے مردِ مومن ہوشیار!

عالمانِ دیں کی دستاروں میں آتے ہیں نظر
وہ بلا کے پیچ و خم جن سے ہوں اژدر شرمسار

ہوشیار!

اے مردِ مومن ہوشیار!

شیعہ وسنی میں ابتک صرف ان کے فیض سے ایک ننگِ پنجتن ہے، ایک ننگِ چار یار

ہوشیار!

اے مردِ مومن ہوشیار!

ڈالتے ہیں اس جگہ قبروں کے شمع وگل سے جال کھیلتے ہیں اس جگہ محراب و منبر سے شکار

ہوشیار!

اے مردِ مومن ہوشیار!

جُرم کی تاریخ کہتی ہے بآوازِ بلند مجرموں سے بڑھ کے اس فن میں ہیں مفتی پختہ کار

ہوشیار!

اے مردِ مومن ہوشیار!

شیطانی زہد

کیا قیامت ہے ایزدِ باری
زہد کے بھیس میں گنہ گاری!

ہاں غلط ہے کہ ہر جگہ شیطان
جمع کرتا ہے کفر کے سامان

بلکہ دیکھا گیا ہے یہ اکثر
کہ یہ ظالم عدوئے نوعِ بشر

راہِ بد ہی نہیں دکھاتا ہے
بلکہ "دیندار" بھی بناتا ہے

کشتیِٔ اتّقا کو کھیتا ہے
حفظِ قرآں کا ذوق دیتا ہے

پیش کرتا ہے خلد کے لذّات
دل کو کرتا ہے مائلِ خیرات

جب شرارت کی حد پر آتا ہے
بھیک منگوا کے حج کراتا ہے

یہی کہہ کہہ کے راہ کرتا ہے گم
کہ خدا کے ہو خاندان سے تم

برتر از جملہ ماسوا ہو تم
یعنی بندے نہیں، خدا ہو تم!

پندارِ عبادت

شب کو اک واقعہ عجب دیکھا
راہ تھی تنگ اور تُند ہوا

آب و آتش میں اضطراب سا تھا
آسمانوں پہ پیچ و تاب سا تھا

بدلیاں تھیں فلک پہ زیر و زبر
اور گلی کے اُداس ذرّوں پر

فاقہ کش، دردمند، سینہ فگار
کروٹیں لے رہا تھا اک بیمار

ہونٹ سمٹے ہوئے، جھکی پلکیں
چہرہ دُھندلا، بجھی ہوئی آنکھیں

سسکیوں سے گرہ سی آہوں میں
موت کی بے رُخی نگاہوں میں

شدتِ تشنگی سے رہ رہ کر
پھیرتا تھا زبان ہونٹوں پر

ناتوانی پہ رات تھی بھاری
ہائے افلاس، وائے ناداری

کپکپاتی ہوئی تھی موجِ ہوا
اللہ اللہ، کراہنے کی صدا

بزمِ ارواح میں تھا اک کہرام
ذرّہ ذرّہ تھا لرزہ بر اندام

سامنے اک نمائشی دیندار
محوِ تسبیح تھا بصد پندار

اِس طرف ایک بندۂ رنجور
اُس طرف ایک عابدِ مغرور

اعبدِ ذلیل　　اِس طرف، عاشقِ خدائے جلیل
ردو بیماری　　اِس طرف بے نیازیاں طاری
کا تھا جوش　　اِس طرف تھی ضخامتِ تن و توش
یہ جامۂ تار　　اِس طرف حجم جبّہ و دستار
خم واں کاڑھی　　اِس طرف تھی گھنی ہوئی داڑھی
کی یہ صدا　　قطرہ، پانی کا، صرف اک قطرہ
ادھر طوفاں　　نعرۂ "یا غفور" و "یا رحماں"
، "پناہ پناہ"　　اِس طرف بار بار "الا اللہ"

اے خدائے بزرگ و ذوالاکرام
تیرے محبوب پر درود و سلام

ہے یہ ہی مقصود　　رحم کی راہ، دل پہ ہو مسدود؟
ہے کہ بعدِ وضو　　برف ہو جائے عابدوں کا لہو؟
ین د ایماں کا　　دل ہو مہرہ بساطِ شیطاں کا؟
ت کی تخئیل　　دل کو کرتی ہے سنگ میں تبدیل؟
یہ پارسائی کا　　خاک دعوے کرے خدائی کا؟

موسمِ گل، خزاں کی رُت بن جائے بت شکن خود ہی ایک بُت بن جائے

ذوقِ تقویٰ میں دل کا نام نہ آئے

آدمی، آدمی کے کام نہ آئے

مولوی

ہوئی اک مولوی سے کل ملاقات شبیہِ قبہؔ و تصویرِ منبر

وہی، ہوں گے جو فردوسِ بریں میں خدا کے فضل سے حوروں کی شوہر

عمامہ برسر و مسواک در جیب اُٹنگا پاجامہ، دلق در بر

حنا سے ریش سُرخ، آنکھوں میں سُرمہ لٹیں مہکی ہوئی، زلفیں معطّر

جُھکے شانے پہ چوخانے کا رومال عبا کے بند میں تسبیحِ احمر

کشادہ صدر، اور کوتاہ گردن شکم پُر رعب، قد رشکِ صنوبر

لٹیں بکھری ہوئی، آنکھوں پہ عینک لبیں ترشی ہوئی، داڑھی شکم پر

عبا عنّاب گوں، دھانی عمامہ گلوری مُنہ میں، لب خونِ کبوتر

کمر کا گھیرا، اک سمٹا سمندر
خدا کے عشق ہیں، وہ دیو پیکر
خدا کے خوف سے چہرہ "گلِ تر"
درود باصفا، ہونٹوں کا پوڈر
حدیثیں بر زباں، قرآں از بر
حنائی ریش، مٹھی میں پکڑ کر!
زباں، آئینۂ خُلقِ پیمبر
ں میں ہنگام تبسم
مکیں، اللہ اکبر!!

فتاہ

معصیت کی، گناہ کی دُنیا
یاں توکّل ہے حرص کا پابند

یاں قناعت سے عارفانِ خدا — کام لیتے ہیں سکّہ سازی کا

ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال — ہر بُنِ مو ہے ایک دستِ سوال

یاں خودی کا لقب ہے "یادِ خدا" — "ترکِ دنیا" کے بھیس میں دُنیا

دل سے ہے بند رسم و راہ یہاں — صرف جیبوں پہ ہے نگاہ یہاں

جمع کرتے ہیں یاں زر و گوہر — جاہلوں کو اجل سے دھمکا کر

ہات آتا ہے روز گنجِ خطیر — "ذکرِ دوزخ" ہے اس جگہ "جاگیر"

یہیں اہلِ صلوٰۃ و اہلِ وضو — چوس لیتے ہیں احمقوں کا لہُو

یاں بہت سے کمال آتے ہیں — ہات چلتے ہیں، حال آتے ہیں

ڈھول کی گت پہ رقص ہوتا ہے — نغمہ چاندی میں ہات دھوتا ہے

یاں زر و مال دینے آتے ہیں — لوگ، اولاد لینے آتے ہیں

زہد میں ایک دھج ہے مستانہ — یاں برستا ہے "ابرِ نذرانہ"

از پئے حرص و آزِ نامسعود — سر بزانو ہے یاں رکوع و سجود

ہر حکایت ہے یاں زر و گوہر — خلد ملتی ہے یاں کرائے پر

سبحۂ گرسنہ کا ہر دانہ — کہہ رہا ہے غذا کا افسانہ

یاں دعاؤں کی فیس ملتی ہے — زر ملے تو زبان ہلتی ہے

یاں مجالس ہیں بہرِ دلداری
جلتی ہے شمع حسنِ بازاری

ایک دریائے ناز بہتا ہے
امردوں کا ہجوم رہتا ہے

پھول چڑھتے ہیں خارزاروں پر
سجدے ہوتے ہیں یاں مزاروں پر

ہے یہاں کفر خیز و شرک پناہ
نعرۂ لا الٰہ الّا اللہ

یاں کے ذرّے نہیں نگینے ہیں
یاں مقابر نہیں، دفینے ہیں

جامۂ فقر ہو چکا ہے رکیک
مانگتی ہیں یہاں عبائیں بھیک

صورتیں، غرقِ خود نمائی ہیں
داڑھیاں، کاسۂ گدائی ہیں

کون بہتر ہے، ایزد باری!
ان کا تقویٰ کہ میری میخواری؟

شیخ کی مناجات

اے خدائے بزرگ و رزق کشا
رکھ سلامت مری عبا و قبا

تیرے بندوں میں ہیں جو صاحبِ زر
میرے آگے جھکاوے ان کے سر

کبھی ہونے نہ دے یہ مطلع صاف — میرے ہی صرف میں ہیں اوقاف

اپنی مخلوق کو جب [illegible] داور! — میرے تعویذ اور گنڈے پر

قوم میں ہیں جو کمتر و برتر — سب پہ چھا جائے میرا چھو منتر

مجھکو ملّت سے عذر ہی منظور — حاکموں کے عتاب سے رکھ دُور

دل سے محکومیوں پہ مرتا ہوں — حاکموں سے بہت میں ڈرتا ہوں

جبر میں ہو فساد سے معمور — مجھ کو اصلاح پر نہ کر مجبور

اُن مواقع پہ جب ہے فرض جہاد — مومنوں کو نہ آئے میری یاد

سختیاں امرِ حق کی میں جھیلوں! — دیکھ تو، کتنا نرم و نازک ہوں

کب بھلا جان دینے والا ہوں — میں ترا نام لینے والا ہوں

کیوں نہ ایماں ہو جان پر قرباں — کیونکہ معبود! تو ہی میری جاں

ہاں، مجاہد میں ہو نہیں سکتا — ہات سے تجھکو کھو نہیں سکتا

میرے ہر عیب کو ہنر کر دے — میری واڑھی دراز تر کر دے

دے مرے رُخ کو صولتِ الہام — اور مُریدوں کو تحفۂ اوہام

حُسن تو خانقاہ کا ہے پھول — عورتوں میں کچھ اور کر مقبول!

مقبروں پر جلال برسا دے — میرے عرسوں پہ حال آ جائے

میری پیری میں زور رہنے دے — چشمِ عالم کو، کور رہنے دے

دے مجھے جملہ بے کمالوں کو — عقل سے دُور رہنے والوں کو

بادۂ الٰہی جو پیتے ہیں ! — سب وہ درویش کے چھیتے ہیں

عقل کی جن پہ بند راہیں ہیں — وہ بشر ہیں مری چراگاہیں

ہر چراگاہ ان میں اے اللہ! — لہلہاتی رہے یہ عزّت وجاہ

جن کو اسلام کا سبق نہ ہوا — کر انھیں خوب صاحبِ اولاد

خوب چمکا مری حق آگاہی — بیوقوفوں کو بخش دے شاہی

ابلہوں کو مرے نہ پہنچے گزند — تجھ کو اہلِ بہشت کی سوگند

ان پہ چلتی ہیں میری تدبیریں — یہ ہیں بندے کی زندہ جاگیریں

سُن مری بات میرا کہنا مان — یا غفور الرحیم ! یا رحمٰن !

گردنوں کے پھرانیوالے بھیج — بھیج ضربیں لگانیوالے بھیج

اہلِ زر کو کسی بہانے بھیج !

سانس لیتے ہوئے خزانے بھیج !

غزل گوئی

آ بتاؤں میں تجھے اے طالبِ راہِ ثواب
کِس کو دینا چاہیئے دنیا میں شاعر کا خطاب؟

یہ لقب جچتا ہے اُس روشن گرِ ادراک پر
عرش کی پرچھائیاں جو دیکھتا ہے خاک پر

آسمانوں کو جھکا رکھا ہو جس کے بام نے
وقت کے جادے کی ہو ہر موڑ جس کے سامنے

جس کے دفتر میں ہو اس کے عہد کی ہر ایک بات
موسم و ماحول و راہ و رسم و آئینِ حیات

جس کے دل میں ہر نفَس غنچوں کی کلیاں سی کھلیں
جس کے دل کے تار ہر ادنیٰ سی جنبش سے ہلیں

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا
"نظم کرتا جا مجھے بھی شاعرِ رنگیں نوا"

جتنے لاتعداد پہلو ہیں حیات و موت کے
شعر بننے کیلئے درخواست دیتے ہوں جسے

قلبِ عارف کی طرح روشن ہو جس کا بال بال
جس کے جذبے ہوں قیامت کے سریع الاشتعال

جو اک ایسا آئینہ ہو شاہراہِ وقت پر
چہرۂ ہستی کے خال و خط ہوں جس میں جلوہ گر

ناپے جس کی نظر ارض و سما کا عرض و طول
اپنی خوشبو جس کو قلبِ تخم سے پہنچائے پھول

مہر بکر جس کے ہر نقطے سے جھلکے اُس کا نام
جس کی سیرت کو مدوّن کر سکے اُس کا کلام

روز و شب مجبور ہو جو سیر کرنے کے لئے
ہر نفَس اک ادیٔ نَو سے گذرنے کے لئے

فکر کی کشتی کو جوئے روح میں کھیتا ہو جو — زندگی کے قلب کی ضربوں کو گن لیتا ہو جو

جس کا دل ہو در حقیقت وہ رصد گاہِ عظیم — جو ہو فطرت کی ہر اک کروٹ کا ہمراز و ندیم

اُڑ رہا ہو جس کا پرچم آب و گِل کے قصر پر — جس کی بینا انگلیاں رہتی ہوں نبضِ عصر پر

چند شعبوں ہی میں گم ہو نہ پائی جس کی ذات — جس کا موضوعِ سخن ہو کل نظامِ کائنات

گھاٹیوں میں گونج کر رہتا نہ ہو جس کا پیام — جو پہاڑوں کی بلندی سے سناتا ہو کلام

یہ اگر شاعر کی ہے تعریف اے اہلِ جہاں — قابلِ ماتم ہیں اُردو کی تہی دامانیاں

رنگ و بو، آب و نمک، نور و ضیا کچھ بھی نہیں — چند نرم و گرم غزلوں کے سوا کچھ بھی نہیں

ان غزل گویوں کا ہے معشوق ایسا نازنیں — نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں

یہ فقط رسمی مقلد وامق و فرہاد کے — مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے

ان کی سیرت ہے انوکھی، ان کی غیرت ہے عجیب — گڑ نہیں جاتے حیا سے یہ اب و جد کے رقیب

آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیبِ روسیاہ — کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ

پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر لے ہر صدا — ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولیؔ کے لب پہ تھا

ان کی حالت وہ ہے جیسے کوئی بزدل خواب سے — "چور آیا، چور آیا" کہہ رہا ہو چونک کے

اور گھر کے جس قدر پیر و جواں ہیں زور زور — اپنے اپنے بستروں پر چیختے ہوں "چور چور"

ان کے دل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ
قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہو جن لوگوں کی باگ

جس طرح معنیٰ کے انگاروں سے آنچ اُٹھے وہاں
جس جگہ لفظوں کی سیلی لکڑیوں کا ہو دھواں

شعر ان کے محض ذرّے ہیں کبھی، تارے کبھی
تین کانٹے ہیں کسی موقع پہ، پو بارے کبھی

شاعری ان کی نہیں ہمرشتۂ پیغمبری
دیر تک چلتی نہیں الفاظ کی بازی گری

سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں
کون ہے ان میں جو بالآخر "کُڑک" ہوتا نہیں

سر سے پا تک بے سُرے ہیں، سر بسر بے تال ہیں
یہ حقیقی شاعروں کے اصل میں نقّال ہیں!

قلب اِن کا قطرۂ شبنم تو ہے چھالا نہیں
کوئی اِن میں زندگی کا دیکھنے والا نہیں

خاتونِ مشرق

غنچۂ دل مرد کا روزِ ازل جب کھل چکا
جس قدر تقدیر میں لکھا ہوا تھا، مل چکا

دفعتہً گونجی صدا پھر عالمِ انوار میں
"عورتیں دُنیا کی حاضر ہوں مری دربار میں"

عورتوں کا کارواں پر کارواں آنے لگا
پھر فضا میں پرچمِ انعام لہرانے لگا

نازسے حوریں ترانے حمد کے گانے لگیں
عورتیں بھر بھر کے اپنی جھولیاں جانے لگیں

جب رہا کچھ بھی نہ باقی کیسۂ انعام میں
کانپتی حاضر ہوئیں پھر ایشیا کی عورتیں

دل میں خوفِ شومیٔ قسمت سے گھبرائی ہوئی
رعب سے نیچی نگاہیں، آنکھ شرمائی ہوئی

حلم کے سانچے میں رُوحِ ناز کو ڈھالے ہوئے
گردنوں میں خم، سروں پر چادریں ڈالے ہوئے

آخر اس انداز پر رحمت کو پیار آ ہی گیا
میکدے پر جھوم کر ابرِ بہار آ ہی گیا

مسکرا کر خالقِ ارض وسما نے دی ندا
اے غزالِ مشرقی! آ، تخت کے نزدیک آ!

نعمتیں سب بٹ چکیں، لیکن نہ ہو نا مضمحل
سب کو بخشے ہیں دماغ، اور لے تجھے دیتے ہیں دل

یہ وہی دل ہے جو مضطر ہو کے سوز و ساز سے
میرے پہلو میں دھڑکتا تھا عجب انداز سے

تجھ کو وہ رُخ اپنی سیرت کا دیئے دیتے ہیں ہم
جس میں یزدانی نسائیت کی زلفوں کے ہیں خم

آ! کہ تجھ کو صاحبِ مہر و وفا کرتے ہیں ہم
لے خود اپنی جنبشِ مژگاں عطا کرتے ہیں ہم

پہلوئے خاتونِ مشرق میں بصد تمکین و ناز
مُنتقل ہو جا الوہیت کے سینے کے گداز

عورتیں اقوامِ عالم کی بھٹک جائیں گی جب
تو رہے گی بن کے اس طوفاں میں اک موجِ طرب

حُسن ہو جائیگا جب اوروں کا وقفِ خاص و عام
دیدنی ہوگا ترے خلوت کدے کا اہتمام

عالمِ نسواں پہ کالی رات جب چھا جائے گی
یہ ترے ماتھے کی بندی صبح کو شرمائے گی

عورتیں بیچیں گی جب اسٹیج پر بارقص و چنگ
اپنی آنکھوں کی لگاوٹ، اپنے رخساروں کا رنگ

اُن کے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ
اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ

گودیاں پھیلا کے جب مانگیں گی باصدق و صفا
عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دُعا

مژدہ باد اے ایشیا کی دُخترِ پاکیزہ تر!
آنچ آئیگی نہ تیرے مادرانہ ذوق پر

ماؤں کی غفلت سے جب بچّوں کو پہنچے گا گزند
جب فغاں بے تربیت اولاد کی ہوگی بلند

صرف اک تیرا تبسّم اے جمالِ تابناک
سینۂ اطفال میں پیدا کریگا رُوحِ پاک

وہ حرارت تیرے ہونٹوں کی نہ ہوگی پائمال
جس کے شعلوں سے نکھر جاتا ہے رنگِ نونہال

وہ تری معصوم رعنائی نہ ہوگی مضمحل
بخشتی ہے نسلِ انسانی کے پہلو کو جو دل

وہ بھی دن آئیگا جب تجھکو ہی از دستِ حجاب
زیب دیگا "مادرِ اولادِ آدم" کا خطاب

جب کرے گی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز
صرف اک تو اس طلاطم میں رہے گی پاکباز

اُن کے دل جب ہونگے یادِ معصیت سے پاش پاش
تیرے رُخ پر ایک بھی ہوگی نہ ماضی کی خراش

ان کی راتیں خوفِ رسوائی سے ہونگی جب دراز
تیرے سینے میں کسی شب کا نہ ہوگا کوئی راز

دہشتِ فردا سے تھرائے گا جب اُن کا غرور
حال سے تو ہوگی راضی، خوفِ مستقبل سے دُور

ب اُڑے گی ان کی چشم دام پرورہ میں خاک　　نرم ڈورے تیری آنکھوں کے رہیں گے تابناک
رم ہوں گے تیرے جلوے بھی، تری گفتار بھی　　باحیا ہو گی تری پازیب کی جھنکار بھی

چھاؤں بھی ہو گی نہ تیری بزمِ نادونوش میں
تیرا پیکر تو تنک رہے گا شرم کے آغوش میں

ے شعارِ ارضِ مشرق! تیری عفّت کا شعار　　کج کرے گا ملک و ملّت کی کلاہِ افتخار
برو ہو گا گھرانے بھر کی تیرا رکھ رکھاؤ　　دے گا تیرا باپ شانِ فخر سے مونچھوں پہ تاؤ
ری آنکھوں کی کرن سے لے جہانِ اعتبار　　جگمگائے گی نسب ناموں کی لوحِ زرنگار
الہوس کا سر جھکا دے گی تیری ادنیٰ جھلک　　ہو گی لہجے میں تری نبضِ طہارت کی دھمک

تیری پیشانی پہ جھلکے گا مثالِ برقِ طور
طفل کا نازِ شرافت اور شوہر کا غرور

م سے ہر چند تجھ کو کم کیا ہے بہرہ مند　　لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت! دردمند
ب ضرورت سے زیادہ ناز فرماتا ہے علم　　عارضِ تاباں کے بھولے پن کو کھا جاتا ہے علم
ق ہو جاتا ہے علمی اصطلاحوں سے اداس　　لعلِ لب میں شہد کی باقی نہیں رہتی مٹھاس
اٹھا لیتا ہے بزمِ جاں سے شمعِ اعتقاد　　خال و خط کی موت ہے چہرے کی شانِ اجتہاد
وحشت کی طرف مڑتی ہے اکثر راہِ فن　　جھانکتی رہتی ہے اس غرفے سے چشمِ اہرمن

چھوڑ دیتی ہے تکلّم کو ملائم قیل و قال — علم کا حد سے گزر جانا ہے توہینِ جمال

علم سے بڑھتی ہے عقل، اور عقل ہے وہ بد دماغ — جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبّت کا چراغ

علم سے باقی نہیں رہتے محبّت کے صفات — اور "محبّت" ہے فقط لے دے کے تیری کائنات

دیکھ تجھ پر علم کی بھرپور پڑ جائے نہ ضرب — بھاگ اس پردہ میں ہیں شیطان کے آلاتِ حرب

علم سے رہتی ہے پابندِ شکن جس کی جبیں — تار سے شانوں پر اسکی زلف لہراتی نہیں

وقت سے پہلے بُلا لیتے ہیں پیری کو علوم — عُمر سے آگے نکل جاتے ہیں چہرے بالعموم

جن لبوں کو چاٹ پڑ جاتی ہے قیل و قال کی — ان کی گرمی کو ترستی ہی جبیں اطفال کی

اک جنوں پرور بگولا ہے وہ علمِ بے وثوق — جس کی رَو میں کانپنے لگتے ہوں شوہر کے حقوق

دُور ہی سے ایسے علمِ جہل پرور کو سلام — حُسنِ نسواں کو بنا دیتا ہو جو جاگیرِ عام

جس جگہ حورانِ جنّت کا کیا ہے تذکرہ — کیا کہا ہے اور بھی کچھ ضم فی جزِ حسن و حیا؟

تذکرہ حوروں کا ہے محض ایک تصویرِ جمال — ہے کم کیا ان کو کہا ہے، صاحبِ فضل و کمال؟

ہیچ ہے ہر چیز، زیور، غازہ، افشاں، رنگ و خال
حسن خود اپنی جگہ ہے سو کمالوں کا کمال

چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار — علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار؟

روشنائی بن کہیں گھلتی ہی موجِ ماہتاب — کیا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب؟

میرے عالم میں نہیں اس بد مذاقی کا شعار
"کا کلِ افسانہ" ہو "دوشِ حقیقت" سے دوچار

حسن کا آغوشِ رنگیں، دلفریب و دل رُبا
علم سے بن جائے اقلیدس کا محض ایک دائرہ!

مصحفِ روئے کتابی روکشِ نازِ گلاب
اور بن جائے لُغت، یا دفترِ علمِ حساب

نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات
بزم کاوش میں جلے شمعِ شبستانِ حیات

گرم ہو تیزاب کی کھولن سے لالے کا ایاغ
غنچۂ نو رس کا طاق، اور ریبرِ مکتب کا چراغ

شہپرِ بلبل پہ کھینچی جائے تصویرِ شغال!
موتیوں پر ثبت ہو طوفان کی مُہرِ جلال!

صبح عرقِ بحث ہو، غنچے کھلانے کے عوض!
درس دیں موجیں صبا کی گنگنانے کے عوض

تو نہ کرنا مغربی متوالیوں کی ریس، دیکھ!
گھات میں تیری لگا ہے فتنۂ ابلیس، دیکھ!

تُو نہ اُن کی طرح بھرنا عرصۂ فن میں چھلانگ
کوکھ تا ٹھنڈی رہے بچوں سے اور صندل سے مانگ

دخترانِ مغربی کو دے نہ عورت کا خطاب
یہ مجسّم ہو گئے ہیں کچھ گنہ گاروں کے خواب

پھر رہی ہیں یا تری نظروں کے آگے پُر فضا
عورتوں کے بھیس میں شیطان کی سرتابیاں

علم حاصل کر فقط تدبیرِ منزل کیلئے
وہ دماغوں کیلئے ہیں اور تو دل کے لئے

خاتونِ مغرب

جب ضمیرِ حق میں انساں کا ہیولیٰ بن چکا
مرد کو فصلِ خزاں کی دھوپ نے پیدا کیا

اور عورت کو بنایا اک سُبک رَو نہر سے
موسمِ گل کی معطر چاندنی کی لہر سے

مرد کو تحفے میں دی شمشیر و تدبیرِ حیات
اور عورت کو چراغ و بربط و قند و نبات

راستے میں مرد کے ڈالے گئے تیغ و تبر
اور عورت کی طرف پھینکے گئے گلبرگِ تر

مرد کے اعضا کو بخشا سنگ و آہن کا جلال
اور عورت کو صبا کا لوچ، شبنم کا جمال

مرد کو بخشا لہو افسردۂ میدانِ جنگ
اور عورت کو ملا پگھلے ہوئے سونے کا رنگ

اُس کو بخشی سنگ کی تعمیر، صرصر کا جلال
اور اسے طبعِ حریر و مستیٔ بادِ شمال

اُس نے صولت پائی، اِس نے جلوۂ مسند طراز
اُس کو محنت دی گئی، اِس کو محبت کا گداز

اُس کو طبلِ جنگ کا ہنگامۂ دہشت فزا
اِس کو ہلکی نرم کلیوں کے چٹکنے کی صدا

اُس کو طوفاں گاہِ بیداری، اِسے خوابِ خیال
اُس کو چشمِ ضیغم و شاہیں، اسے چشمِ غزال

اُس کو شانِ مہر، اس کو جلوۂ ماہِ منیر
اُس کو سنگ آشوب تیشہ، اِس کو رقصِ جوئے شیر

اُس کو تاجِ غزنوی، اِس کو خمِ زلفِ ایاز
اُس کے ماتھے کو شکن، اِس کے لبوں کو موجِ ناز

اُس کو چھانٹا زخمِ دندانِ طلاطم کے لئے
اِس کو رکھا پاک بچّوں کے تبسّم کے لئے

اُس کو شورِ حرب، اِس کو شوخئ گفتار دی
تیغ کی اُس کو، اِسے پازیب کی جھنکار دی

مرد کے زانو کی جنّت بن گیا عورت کا سر
کچھ دنوں چلتی رہی دُنیا اِسی انداز پر

لیکن اک شب دفعتہً تاریکیوں کے درمیاں
جب فرازِ چرخ پر منڈلا رہی تھیں بدلیاں

تنگ تھا دُنیا کے ننھّے سے کُرہ کا عرض و طول
ہو رہا تھا چرخ سے اوہامِ باطل کا نزول

رات یوں تاریک تھی جس طرح مجرم کا ضمیر
سَر کیا شیطان نے عورت کی جانب ایک تیر

سُرخ تیر افسردہ تاریکی میں سنّاتا ہوا
آتے ہی عورت کے سینے میں ترازو ہو گیا

تیر کھانا تھا کہ رُوحِ ناز بل کھانے لگی
مرد بننے کی تمنّا دل کو تڑپانے لگی

دی صدا عورت نے اِس نرمی کو کھونا چاہئے
مرد کا مدِّ مقابل مجھ کو ہونا چاہئے

نازکی ہے اِک اہانت آفریں افتادگی
مسکرائی ہوگی میری لوچ پر مردانگی

ابنِ آدم کی مٹا دیں نازشِ تاب و تواں
مرد بن جائیں اگر حوّا کی نازک بیٹیاں

ماورِ عالم کے غنچوں کو بھی کھِلنا چاہیے
ہم کو بھی حقِ مرد کے مانند ملنا چاہیے

روح پر عورت کی یہ دیوانگی جب چھا گئی
تو، سحر ہوتے ہی وہ مردوں کی صف میں آ گئی

آئی، اور خم ٹھونک کر آئی مثالِ پہلواں
پنڈلیاں گھومی ہوئی، شانوں کی اُبھری مچھلیاں

ترک کر بیٹھی ادا و ناز کا "شغلِ رکیک"
اب ہے وہ دُنیا کی ہر مردانہ ورزش میں شریک

باگ پر ہے ہات، اور ترشی ہوئی زلفوں پہ گرد
تن کے کہتی ہے کہ دیکھو زن سے یوں بنتے ہیں مرد

لیکن اس دریا میں ہے زہراب کی بھی ایک موج
کس گراں قیمت پہ عورت نے خریدا ہے یہ اوج

اپنے سینے کا خزانہ، اپنی فطرت کا جمال
مرد بننے کی ہوس میں کر دیا ہے پائمال

کرچکی ہے بے طرح محرومِ چشمِ التفات
اپنے اس شیریں تبسّم کو، کہ تھا اک کائنات

یوں ہوا آمادہ فطرت سے بغاوت پر شباب
پڑ گئے رخسار پھیکے، جل گئی چہرے کی آب

زلف چھوٹی ہو گئی اور دست و پا کھنچ کر طویل
بجھ گئی برنائی، روڑھا ہو گیا روئے جمیل

جذبۂ مردانگی نے بڑھ کے تلووں سے ملی
جُنبشِ مژگاں کی موسیقی، تبسّم کی کلی

جِلد کی سختی کے اندر لوچ پنہاں ہو گیا
ایک سیٹھاپن سا ہونٹوں پر نمایاں ہو گیا

جنّتِ ارضی کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
چشمکِ بیباک نے آنکھوں کو سُونا کر دیا

جامِ زریں کی کھنک گم ہوگئی گفتار سے
ابر کی سی شوخیاں جاتی رہیں رفتار سے

ہوگیا سنگِ خرد سے شیشۂ بھولپن کا چور
مر گیا دیدوں کا پانی، اڑ گیا چہرے کا نور

بن گئی القصہ اک ایسا سوالِ ناصواب
عشق کے ہونٹوں سے مل سکتا نہیں جس کا جواب

نازکی، عزت، محبت، آبرو کچھ بھی نہیں
نام تو ہے پھول، لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

بلوغِ حیات

ک زمانہ وہ بھی تھا اے دوستانِ باصفا
ابر سا رہتا تھا میری روح پر چھایا ہوا

یش، رسمِ دشمنی پر طیش آتا تھا مجھے
غصہ انگاروں پہ راتوں کو لٹاتا تھا مجھے

سامنے آتی تھیں جب انسان کی عیاریاں
اڑنے لگتی تھیں مرے انفاس سے چنگاریاں

یکھتا تھا جب کبھی ناپاک یاروں کا بطون
ابتداءً میری آنکھوں میں اتر آتا تھا خون

وڑتی تھی دوستی جب دشمنی کی سمت باگ
میری افغانی رگ و پے میں بھڑک اٹھتی تھی آگ

یکھتا تھا جب کبھی ظلم و ستم احباب کا
دل میں کھنچ آتا تھا سب لوہا مرے اعصاب کا

وح پر جب ڈالتی تھیں سازشیں پرچھائیاں
میرے احساسات کے سینے سے اٹھتا تھا دھواں

شیشۂ دل پر گرا دیتے تھے جب احباب سنگ
گونج اُٹھتا تھا مری ہستی کے اندر طبلِ جنگ

ہر نفاق و بغض پر خود سے گزر جاتا تھا میں
گونجتا تھا، گرم ہوتا تھا، بپھر جاتا تھا میں

زندگی جب بحرِ نفرت میں ڈبوتی تھی مجھے
سانس میں اک آنچ سی محسوس ہوتی تھی مجھے

جب حریفوں کی حسد کوشی کو پا جاتا تھا میں
چوٹ کھائے اژدھے کی طرح بل کھاتا تھا میں

بغض ٹکراتا تھا جب آ کر دلِ حق کوش سے
لو نکل پڑتی تھی میرے سینۂ پُر جوش سے

دوستی سے دشمنی کا جب پہنچتا تھا پیام
ہو بھڑکنے لگتا تھا میرے دل میں شیرِ انتقام

راگنی کو بوجھنے لگتا تھا جب بجتی تھی تانت
مٹھیوں کو بند کر کے پیسنے لگتا تھا دانت

دیکھتا تھا آدمی کو جب دنائت کا شکار
اینٹھنے لگتی تھیں گردن کی رگیں بے اختیار

دل یہ کہتا تھا کہ ہر سینے میں خنجر بھونک دوں
خلق کو بھڑکے ہوئے دوزخ کے اندر جھونک دوں

زندگی کی موج میں زہرِ ہلاہل گھول دوں
جی میں آتا تھا کہ توپوں کے دہانے کھول دوں

ذبح کر دوں، قتل کر ڈالوں، سروں کو پھوڑ دوں
ہمتوں کو پست کر دوں، گردنوں کو توڑ دوں

خون کی پیاسی زمیں کو آدمی کا خون دوں
خاک کر ڈالوں، بھسم کر دوں، جلا دوں، بھون دوں

قہر بن کر میں جوابِ فتنۂ ابلیس دوں
دفن کر دوں، سرمہ کر ڈالوں، رگڑ دوں، پیس دوں

(۲)

لیکن اس مدت میں جب بالغ ہوئی میری حیات
آنکھ جھپکانے لگے دل میں رموزِ کائنات

دیکھتا کیا ہوں کہ ماحول و وراثت کا جُوا
نوعِ انساں کے سبک شانے پہ ہی رکھا ہوا

فطرت و طینت، سرشت و تربیت، طبع و ضمیر
ایک انساں اور اتنے قید خانوں کا اسیر

کیا جہالت تھی کہ کھاتا تھا بشر پر پیچ و تاب
حد سے اس معصوم کو دیتا تھا "مجرم" کا خطاب

جس کے افسانے کا ہے عنوان آدم کا ہبوط
جس کی پیشانی پہ ہیں جبرِ مشیّت کے خطوط

پھول، انگاروں پہ راتوں کو لُٹاتا تھا مجھے
حیف اس مظلومیت پر تاؤ آتا تھا مجھے

(۳)

اب مرا غیظ و غضب اپنے سے شرمانے لگا
مجھ کو انساں کے گناہوں پر "ترس" آنے لگا

بھید پاتا تھا کہ دل سے غیظ کم ہونے لگا
آدمی کی بے نوائی دیکھ کر رونے لگا

(۴)

اور جب اس سے بھی کچھ گہری نظر جانے لگی
مجھکو انساں کی خطاؤں پر "ہنسی" آنے لگی

غصہ رخصت ہو گیا، آنسو ٹپک کر بہہ گیا
صرف اک ہلکا سا ہونٹوں پر تبسّم رہ گیا

بیقراری کے عوض دل کو قرار آنے لگا
نوعِ انسانی کی "گمراہی" پہ پیار آنے لگا

(۵)

آگ تھی غصّے کی پہلے زندگی کی خاک میں
پھر سبک اشکوں کا پانی تھا دلِ غمناک میں

اور اب موجِ تبسّم ہے لبِ خاموش پر
اے خدائے نارِ دوزخ! رحم فرما جوش پر

اے خطاکاروں کے صانع ، اے جہنّم کے اِلٰہ ! "بندہ" ہو کر جو کوئی تیری خلق کا ہے خیر خواہ
پھر سے اس "معصوم مجرم" کو ستایا جائیگا؟ کیا عزیب انسان دوزخ میں جلایا جائے گا؟
آہ میں افسردہ دل کس سے کہوں یہ واردات کس قدر شائستۂ رحمت ہے انسانی حیات

(۶)

اے حقیقت میں نگاہو ، مرحبا صد مرحبا گلشنِ اسرار کی آئے لگی دل تک ہوا
تم نے اک بے آب پتھر کو نگینہ کر دیا ایک پامالِ جنوں اندھے کو بینا کردیا

(۷)

اے حریفو ، دشمنو ، یارو ، عزیزو ، دوستو! اک نرالی بات کہتا ہوں سنو اور درس لو
غیظ و غم ، خوف و خطر ، بیم و رجا کچھ بھی نہیں میرے دل میں اب محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں
اب کوئی تم میں سے دل میرا دُکھا سکتا نہیں اب قدم راہِ وفا میں ڈگمگا سکتا نہیں
اک نیا احساس اس سینے میں اب پاتا ہوں میں دشمنی کرتے ہیں دشمن ، اور شرماتا ہوں میں
بے کس و مجبور انساں کو دُعا دیتا ہوں میں
وار کرتا ہے کوئی تو مُسکرا دیتا ہوں میں

سونے کی تلوار

کل پھر رہا تھا صحنِ چمن میں کشاں کشاں
اپنی ادھیڑ زوجہ کی ہمراہ اک جواں
شوہر کی بے وسیلہ جوانی پر الاماں
بیوی کے مالدار بڑھاپے کی سختیاں
بے مال و زر شباب کا تھا شیب پر مدار

تھیں جھریاں جو زوجہ کے چہرہ پہ بیش و کم
ان جھریوں کی راہ پہ چاندی کے تھے قدم
شوہر کے عارضوں میں بہ افراط رنج و غم
سویا ہوا تھا سازِ جوانی کا زیر و بم
گائی ہوئی خزاں تھی، سسکتی ہوئی بہار

پانی کی ایک بوند سے مرعوب تھا شرر
حیراں شکوہِ قطرۂ شبنم سے تھا گہر
چھالے کے طمطراق سے لرزاں تھا نیشتر
ذرے پہ آفتاب جھکائے ہوئے تھا سر
کمزوریوں کو زور پہ حاصل تھا اقتدار

ٹھنڈی ہوا سے وجد میں تھی روحِ بوستاں
سرشار ہو چلی تھی زمیں، پست آسماں
زوجہ کے ساتھ ساتھ تھا شوہر رواں دواں
اک موڑ پر مڑی ہی تھی دونوں کہ ناگہاں
گزری ادھر سے ہو کے اک آئینہ رو نگار

اس طرح ناؤ جیسے کوئی ڈولتی ہوئی ابرو کے بل سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
تلوار سی ہر ایک لچک، تولتی ہوئی گاتی ہوئی ادائیں، نظر بولتی ہوئی
زلفوں کے پیچ و خم میں لئے موجِ آبشار

شوہر کی اُٹھ کے جم گئی اس شوخ پر نگاہ پلکوں نے سسکیاں سی بھریں اور نظر نے آہ
چمکی نگاہِ زوجہ میں شمشیرِ اشتباہ پیدا ہوئی وہ آگ کہ اللہ کی پناہ!
آفت کی کش مکش تھی، قیامت کا خلفشار

رحمت سے آس جیسے گنہ گار توڑ دے کوئی بہک کے ساغرِ سرشار توڑ دے
گھبرا کے جیسے دم کوئی بیمار توڑ دے جس طرح کوئی جنگ میں تلوار توڑ دے
شوہر نے یوں جھکائی نظر ہو کے شرمسار

اتنا ڈرا غریب کہ تپنے لگا جگر بیگانہ وار آنکھ اٹھائی اِدھر اُدھر
گردن ہلائی بیوی نے غصّے سے دیکھکر یعنی متاعِ زوجہ نے شوہر کے حلق پر
سونے کی بڑھ کے پھیر دی شمشیرِ آب دار

حرف و حکایت

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے کلام کا چوتھا اور تازہ ترین مجموعہ، جو جوش ملیح آبادی کی شاعری کے عروج و ارتقا کا علمبردار ہے۔ "پایر دن لیگ" وہ مشہور و معروف نظم ہے جس کے "کلیم" میں سال گذشتہ شائع ہوتے ہی ایوان مسلم لیگ میں زلزلہ آگیا تھا۔ اور حضرت جوش کے خلاف مسلم لیگ کے علماء نے کفر کا سرٹیفکیٹ عنایت فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ "ساون کے مہینے" وہ نظم ہے جس کا جواب انگریزی ادب میں فطری شاعری کے علمبردار ورڈسورتھ کے کلام میں بھی نہیں ہے۔ الغرض اس مجموعہ کی ہر نظم یا یوں کہئے کہ ہر شعر اُردو شاعری کے دور ارتقا کا زبان حال سے شاھد اور رومانیت کا علمبردار ہے۔ اگر حضرت جوش کے کلام کا یہ گراں بہا مجموعہ ابتک آپکی نظروں سے نہیں گذرا ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو معلوم ہی نہیں کہ اردو شاعری اس وقت عروج کی کس منزل پر ہے۔ اس مجموعہ کی ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحات، کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ چکنا۔ اسمیں حضرت جوش کا تازہ ترین فوٹو بھی شامل ہے اور ان ظاہری و باطنی خوبیوں کے باوجود قیمت مجلد صرف دو روپے آٹھ آنہ۔

نقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے کلام کا پہلا مجموعہ اور انکی شہرت کا سنگ اولین ہے۔ یہ مجموعہ پانچ ابواب پر منقسم ہے (۱) نگار خانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر اور (۵) نسیب۔ اس مجموعہ کی ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرصع اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے اور اسکے مسحور کُن نغمے دل و دماغ کیلئے ایک مستقل سکون اور روح کیلئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۵ء میں چھپا اور ۱۹۳۶ء میں ناپید ہوچکا تھا۔ اب دوسرا اڈیشن خاص اہتمام سے نہایت خوبصورت شائع ہوا ہے۔

قیمت صرف دو روپے مجلد۔

شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی پُرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ جسمیں آپکو آتشکدے (سیاسیات) کی شعلہ افشانیاں، اسلامی شان و حریت کے خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ سرجوش (غزلیات) کی سرمستیاں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغمے اس الہامی زبان میں ملیں گے جس کا جواب اُردو تو کجا دُنیا کی کسی زبان کی شاعری میں بھی آپ کو نہ ملے گا۔ اب اس کا دوسرا اڈیشن نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا۔ جلد آرڈر بھیجئے تاکہ آپ کو تیسرے اڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

قیمت مجلد تین روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ رشیدیہ۔ اُردو بازار دہلی